برصغیر میں محدثین کی خدمات حدیث، تاریخی و تجزیاتی جائزہ

Services of "Muhaddesin" in the sub-continent (A historical & critical analysis)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر*
ڈاکٹر میمونہ تبسم *

ABSTRACT

After the Prophet ﷺ the Muslims all over the world associate themselves with him by following his pious deeds and acting upon his sayings (Hadith). The Muslims of the sub-continent have been very zealous in this respect and have done great job in this regard.

In the subcontinent, the sayings of the Holy Prophet reached with Islam during the era of pious caliphs. In those days, according to some traditions, 25 companions of the Holy Prophet ﷺ Sahaba (R.A) and 42 Tabe-ien (those who had seen the Sahaba R.A i-e their successors) came to India and preached Islam.

This preaching was continued by later Muslims and the rulers like Mohammad Bin Qasim and Mehmood Ghaznavi.The services of great Muhaddeseen (narrators and illustrators of the sayings of the Holy Prophet ﷺ like Musa Bin Yaqoob, Yazid Bin Abi Kabsha, Abu Musa Israeel Bin Musa and Abu Hafs Rabi Bin Sabih are note worthy. They provided local people the knowledge of Hadith. These scholars earned fame and prestige by their great works in this field. Shah Waliuallah wrote Mussffa and Maswwa, in subcontinent there are great many institutions like Jamia Salfiya Faisalabad, Jamia Ashrafia Lahore, Jamia Naeemia Lahore, Khair-ul-Madaras Multan, Jamia Mohammadia Gujranwala, Dar-ul-Hadith Delhi and Jamia Salfiya Banaras to teach the knowledge of Hadith.

Keywords: Services, Muhaddasin, subcontinent, preaching, Muslims.

---

* چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ یونیورسٹی آف سرگودہا
* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ ، گورنمنٹ کالج خواتین یونیورسٹی لاہور

عرب و ہند کے تعلقات بہت پرانے ہیں ان تعلقات کی قدامت کا اندازہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے البتہ اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ روابط کرہ ارض پر انسانی وجود کے ساتھ ہی قائم چلے آرہے ہیں۔ قصص الانبیاء کی اہم کتب کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے دنیا کی طرف بھیجے گئے تو وہ ارض ہند کے جنوبی علاقہ سری لنکا میں اتارے گئے[۱] ۔ جب کہ ان کی بیوی حضرت حوا علیہا السلام سعودی عرب کے موجودہ شہر جدہ میں اتاری گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام ہند سے چل کر حضرت حوا علیہا السلام کو عرب میں عرفات کے میدان میں جاملے جو مکہ مکرمہ کے قریب ہے[۲] ۔

یہ عرب اور ہند سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد زمانہ قدیم سے اب تک اہل ہندوستان سے عربوں کے تعلقات چلے آرہے ہیں۔ عرب لوگ تاجر پیشہ تھے وہ آس پاس کے ملکوں کی منڈیوں سے تجارتی مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ عرب و ہند میں سندھ، مکران اور جنوبی عرب کے ساحل اس قدر قریب ہیں کہ ان کے درمیان تجارتی تعلقات اور دوسرے روابط قائم ہو جانا ایک ناگزیر اور فطری عمل تھا۔ عربوں اور ہندوستانیوں میں قدر مشترک بت پرستی اور غیر اللہ کی پوجا تھی۔ عرب تاجر عموماً جنوبی ہند کی بندرگاہوں میں مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ بعض عرب تاجروں نے جنوبی ہند کے ساحلی شہروں میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ اس طرح قبل از اسلام ہی سے دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے سے متعارف تھے[۳] ۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ ہندوستان اور اس کی چیزوں سے واقف تھے۔ اور ان چیزوں میں مشک، کافور، زنجبیل (ادرک)، قرنفل (لونگ) فلفل (مرچ)، عود ہندی، قسط ہندی، ساج (ساگوان کی لکڑی)، ہندی تلواریں شامل ہیں۔ یہاں کے بعض کپڑے بھی عرب میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اکثر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان ہندوستانی اشیاء کو حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ بھی استعمال فرماتے تھے۔ احادیث رسول ﷺ میں بھی ہندوستان کا تذکرہ موجود ہے۔ حدیث میں ہند کا لفظ آیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

((عِصَابَتَانِ مِنْ أُمَّتِي أَحْرَزَهُمَا اللَّهُ مِنْ النَّارِ عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَعِصَابَةٌ تَكُونُ مَعَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَام)) [۴]۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے۔ ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا وہ جو حضرت عیسیٰؑ کا ساتھ دے گا۔

اہل ہندوستان کو ظہورِ اسلام کی خبر اسی وقت ہی پہنچ گئی تھی جب اس عالمگیر دین کا دروازہ اہل مکہ پر کھلا [۵]۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ قافلے جو عرب و ہند کے درمیان بغرض تجارت رواں دواں تھے پہلے پہل اسلام نے انہی کے ہاتھوں ہندوستان کی سرحد پار کی [۶]۔

مگر برصغیر میں خلفائے راشدین کے زمانہ میں باقاعدہ اسلام آ گیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں مغربی ہندوستان میں ممبئی اور تھانہ میں مسلمانوں کی آبادیاں وجود میں آچکی تھیں۔ عام طور پر یہ تابعین تھے جو ہندوستان میں آئے اور جن کی آبادیاں برصغیر میں قائم ہوئیں۔ انہی تابعین کے ہاتھوں میں برصغیر میں اسلام باقاعدہ طور پر داخل ہوا [۷]۔

رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور خلفائے راشدین نے مختلف بلاد و امصار میں صحابہ و تابعین دینی تعلیم کے لیے روانہ کیے تو انہوں نے احادیث و شرائع کی اشاعت کی۔

امام ابن ابی حاتم لکھتے ہیں۔

"ثم تفرقت الصحابةؓ فی النواحی والأمصار، والثغور فی فتوح البلدان والمغازی والأمارة والقضاء والأحکام، فبعث کل واحد منهم فی ناحیة وبالبلد الذی هو به، ما وعاه وحفظه عن رسول اللهﷺ،وحکموا بحکم الله عزوجل، وامضوا الأمور علی ماسن رسول اللهﷺ" [۸]۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ مختلف شہروں، علاقوں اور سرحدوں میں فتوحات، مغازی، امارات، قضاء اور احکام کے سلسلے میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے علاقہ اور شہر میں رسول اللہ ﷺ سے جو احادیث سن رکھی تھیں، سب کو عام کیا اور ان حضرات نے اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی سنن جاری کیں اور رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر امور و معاملات کو چلایا۔

حافظ ابن کثیرؒ، محمد بن قاسمؒ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''وقبل ذلك قد كان الصحابة فی زمن عمر وعثمان فتحوا غالب هذه الأقاليم الكبار مثل الشام و مصر والعراق واليمن واوائل بلاد الترك ودخلوا الى ماوراء النهر واوائل بلاد المغرب واوائل بلاد الهند"[۹]۔

ترجمہ: سندھ میں محمد بن قاسمؒ کی فتوحات سے پہلے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نے ان اطراف کے اکثر حصہ کو فتح کیا اور شام، مصر، عراق، یمن اور اوائل بلاد ترک کے وسیع و عریض اقالیم میں پہنچے۔ نیز وہ حضرات علاقہ ماوراء النہر، اوائل بلاد مغرب اور اوائل ہند میں داخل ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پندرہ ہجری کو حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں صحابی رسول عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ نے ہندوستان پر لشکر کشی کی[۱۰]۔ اس کے علاوہ مزید ہندوستان کے خلاف مہموں میں جن صحابہؓ نے حصہ لیا ان میں سے یہ نام ملتے ہیں۔ ۱۔ عبداللہ بن عبداللہ عتیقؓ۔ ۲۔ عاصم بن عمر تمیمیؓ۔ ۳۔ صحار بن العبدیؓ۔ ۴۔ سہیل بن عدیؓ۔ ۵۔ الحکم بن ابی علی ثقفیؓ [۱۱]۔ انہی سے برصغیر میں باقاعدہ علم حدیث کا آغاز ہوا۔ کیوں کہ صحابہ کرامؓ کے تمام اقوال و افعال حدیث رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کئی ایک صحابہؓ ہند آئے وہ اس ملک میں علم حدیث کی اشاعت کے چلتے پھرتے مدرسے تھے۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات ایسے تھے جن میں اشاعت حدیث کا کام پوری توجہ سے انجام نہیں دیا جاسکتا تھا [۱۲]۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

"صحابہ کرامؓ کا ہر قول ہر عمل حدیث رسول ﷺ اور ارشادات پیغمبر سے ہم آہنگ تھا۔ وہ جہاں جاتے فرامین نبوت ﷺ ان کے ساتھ جاتے، جن سے زندگی کے تمام نشیب و فراز میں رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی احادیث مبارکہ کا قلب نواز گنجینہ اور روح پرور ذخیرہ ان کے ساتھ آیا۔ آنحضرت ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چار سال بعد 15 ہجری میں صحابہ کرامؓ کی جو جماعت آئی، وہ حدیث رسول ﷺ اپنے ساتھ لائی" [۱۳]۔

بھٹی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"برصغیر میں اسلام کے یہ اولین نقوش ہیں، جو پہلی مرتبہ ۱۵ ہجری میں اس کی سطح ارض پر ابھرے اور پھر تاریخ کے ایک خاص تسلسل کے ساتھ پوری تیزی سے لحہ بہ لحہ ابھرتے اور نمایاں ہوتے چلے گئے"(۱۴)۔

برصغیر میں تشریف لانے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے نام و حالات آج کتب میں دستیاب ہیں ان کی تعداد قاضی اطہر مبارکپوری کے مطابق ۱۷ ہے۔ قاضی محمد اسلم سیف اور مولانا محمد اسحاق بھٹی کے مطابق ۲۵ ہے۔ جن میں مدرک اور صغار صحابہ بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ۱۲ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں، پانچ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں، تین حضرت علیؓ کے دور امارت میں، چار حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں اور ایک نے یزید بن معاویہ کے دور حکمرانی میں برصغیر میں قدم رنجاں فرمایا(۱۵)۔

برصغیر میں تشریف لانے والے صحابہ کرامؓ

۱۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ: یہ جلیل القدر صحابی قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے اور طائف کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے رمضان المبارک ۹ ہجری کو بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ۱۴ ہجری کو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو بصرہ میں معلم مقرر کر دیا تھا۔ پھر ۱۵ ہجری میں حضرت عمرؓ نے انہیں عمان اور بحرین کے علاقوں کا گورنر بنا دیا۔ اسی سال حضرت عثمان بن ابو العاصؓ نے عمان میں ایک بحری بیڑا تیار کرایا اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن ابی العاص ثقفیؓ کی قیادت میں اسے ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اسلامی حکومت کا یہ پہلا بحری بیڑا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ کے حکم سے تیار کیا گیا اور یہی وہ اولین بحری بیڑا ہے جو موجودہ جغرافیائی اعتبار سے بمبئی کے قریب تھانہ اور بھڑوچ کی بندرگاہوں کی طرف حرکت کناں ہوا۔ مجاہدین اسلام نے ان بندرگاہوں کو فتح کیا، لیکن ان پر قبضہ برقرار نہیں رکھا اور واپس عمان چلے گئے۔ ہندوستان کے کسی علاقے میں عرب مسلمانوں کا یہ پہلا حملہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ یہ پہلا کاروان تہذیب اسلامی اور اولین قافلہ حاملین حدیث رسول ﷺ تھا جو عازم ہند ہوا۔ صحابی رسول ﷺ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے مشہور روایت کے مطابق ۵۵ ہجری میں وفات پائی(۱۶)۔

۲۔ حضرت حکم بن ابی العاص ثقفیؓ: یہ حضرت عثمان ابی العاصؓ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ پندرہ ہجری کے بعد ہندوستان میں آئے، بلاد سندھ و ہند میں سے بندرگاہ تھانہ، بھڑوچ، دیبل اور مکران کے علاقہ میں یلغار کی اور زندگی کے آخری ایام بصرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں ہی ۴۵ ہجری میں وفات پائی[۱۷]۔

۳۔ حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفیؓ: یہ بھی حضرت عثمان ثقفیؓ کے بھائی ہیں۔ اور انہوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ ہی برصغیر میں کئی ایک مقامات پر فتوحات حاصل کیں۔ انہوں نے زندگی کے آخری ایام بصرہ میں گزارے اور وہاں ان کا انتقال ہوا[۱۸]۔

۴۔ ربیع بن زیاد حارثیؓ: یہ عرب کے قبیلہ بنو مذحج سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۷ ہجری کو عہد فاروقی میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت ربیع کو مختلف محاذوں پر لشکر اسلامی کا کمانڈر بنا کر بھیجا تو انہوں نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا اور ہر محاذ پر دادِ شجاعت حاصل کی۔ اس زمانے میں سجستان کا زیادہ علاقہ سندھ میں شامل تھا اور کچھ حدود ایران میں واقع تھا، اس محاذ پر بھی وہ گئے اور فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے۔ عہد فاروقی میں انہوں نے زرنج، زالق، کابل، سیوستان، کرمان اور مکران کی جنگوں میں شرکت کی۔ کرمان، مکران اور سیوستان کے گورنر بھی رہے۔ ان میں سے بعض علاقوں کا کچھ حصہ اس عہد میں پاکستان کے موجودہ صوبہ بلوچستان میں اور کچھ حصہ سندھ میں شامل تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ان علاقوں میں حضرت ربیع نے جو سلسلہ جہاد شروع کیا تھا، وہ حضرت معاویہؓ کے زمانہ حکومت میں بھی جاری رہا۔ حضرت ربیع بن زیاد حارثی مذحجیؓ چوتھے صحابی رسول ﷺ ہیں جو حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں بسلسلہ جہاد وارد برصغیر ہوئے۔ اس نواح میں نبی ﷺ کی احادیث کی تبلیغ فرمائی۔ انہوں نے عہدِ معاویہ میں ۵۱ ہجری کو یا اس سے کچھ عرصہ بعد وفات پائی[۱۹]۔

۵۔ حضرت حکم بن عمرو بن مجدع ثعلبیؓ: عرب کا ایک مشہور قبیلہ بنو غفار تھا، جس کی ایک شاخ بنو ثعلب کہلاتی تھی۔ موصوف کا تعلق بنو غفار کی اسی شاخ سے تھا۔ اسی وجہ سے انہیں ثعلبی غفاری کہا جاتا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۷ ہجری میں حضرت حکم کو مکران کا والی مقرر کیا اور لواءِ مکران سے نوازا۔ ۲۳ ہجری میں حضرت حکم نے پورے علاقہ مکران پر چڑھائی کی اور اسے فتح کیا۔ مکران کا یہ وہ حصہ تھا جو موجودہ بلوچستان میں شامل تھا۔ مکران اور اس کے قرب و جوار کا حکمران اس زمانے میں راجا راسل تھا جو ایرانیوں کا طرف دار اور باجگزار تھا۔ اس نے مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی۔ حضرت

معاویہؓ نے اپنے دورِ حکومت میں حضرت حکم کو خراسان کا والی مقرر کر دیا تھا۔ بہ اختلافِ روایات انہوں نے ۵۰ یا ۵۱ ہجری کو خراسان میں وفات پائی (۲۰)۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ عتبان انصاری: ۲۳ ہجری میں عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ کو مکران (بلوچستان) بھیجا گیا۔ اس وقت مکران میں حضرت حکم بن عمرو غفاری مصروف جہاد تھے۔ عبداللہ بن عبداللہ انصاری نے جہادِ مکران میں حکم بن عمرو غفاری کی مدد کی (۲۱)۔

۷۔ حضرت سہل بن عدی بن مالک خزرجی انصاریؓ: حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ سہل بن عدی کو مکران کا والی مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت سہل مکران گئے اور علاقہ مکران اور اس کے گرد و نواح کی فتوحات میں نمایاں کردار ادا کیا، جس میں حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ نے بھی ان کی مدد کی۔ حضرت حکم بن عمرو غفاری بھی ان معرکوں میں شریک تھے۔ یہ تینوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کے صحابیؓ تھے۔ یہ ۲۳ ہجری کا واقعہ ہے۔ اسی سال بلوچستان کے بعض علاقے فتح کیے گئے (۲۲)۔

۸۔ حضرت شہاب بن مخارق تمیمیؓ: حضرت حکم بن عمرو ثعلبی جب مکران میں مصروف پیکار تھے تو یہ وہاں پہنچے اور شریک جہاد ہوئے۔ اس طرح ارض برصغیر کو ان کی قدم بوسی سے بہرہ یاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی (۲۳)۔

۹۔ حضرت صحار بن عباس عبدیؓ: یہ صحابی نے ۵ ہجری میں دربار نبوی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور جنگ مکران میں حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت میں شرکت کی (۲۴)۔

۱۰۔ حضرت عاصم بن عمرو تمیمیؓ: انہوں نے جنگ قادسیہ میں بھی حصہ لیا اور فتح عراق میں بھی شامل رہے۔ اسی طرح نواح سندھ میں یلغار کی اور سجستان کے قرب و جوار کا وہ علاقہ جو سندھ سے ملحق تھا ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی زد میں آیا اور مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا (۲۵)۔

۱۱۔ حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعیؓ: حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی رسول اللہ ﷺ کے وہ صحابی ہیں جو عہد فاروقی میں ۲۳ ہجری کو جنگ سجستان میں حضرت عاصم بن عمرو تمیمیؓ سے ملے اور ان دونوں کی جدوجہد سے وہ علاقہ فتح ہوا جو اس زمانے میں بلاد سجستان سے لے کر سندھ کے اندرونی حصے تک پھیلا ہوا تھا اور دریائے بلخ بھی اس میں شامل تھا (۲۶)۔

۱۲۔ حضرت نسیر بن دیسم بن ثور عجلیؓ: ان کو عرب کے قبیلہ بنو عجل کا فرد شمار کیا جاتا ہے۔ ۲۳ ہجری میں جب حضرت سہل بن عدیؓ نے علاقہ قفص یعنی موجودہ بلوچستان کا کچھ حصہ فتح کیا تو یہ ان کے ساتھ تھے (۲۷)۔

۱۳۔ حضرت حکیم بن جبلہ عبدیؓ: یہ صحابی عرب کے قبیلہ بنو عبدالقیس سے تعلق رکھتے تھے اور یہ پہلے مسلمان سیاح تھے جو سیاحت کی غرض سے برصغیر پاک و ہند کے بعض علاقوں میں آئے اور وہاں کے حالات و قوائف سے واقفیت حاصل کی۔ پھر دوبارہ حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت میں ان کو برصغیر پاک وہند میں آنا پڑا مگر زندگی کے آخری ایام بصرہ میں گزارے اور وہاں پر کسی نے ان کو شہید کر دیا(۲۸)۔

۱۴۔ حضرت عبید اللہ بن معمر قریشی تمیمیؓ: حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں انہیں فوج کا ایک دستہ دے کر مکران اور سندھ کی طرف بھیجا گیا تھا فتوحات مکران میں انہوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ اور مشہور روایت کے مطابق اصطخر کے ایک معرکے میں جام شہادت نوش کیا (۲۹)۔

۱۵۔ حضرت عمیر بن عثمان بن سعدؓ: ۲۹ ہجری کے قریب حضرت عثمانؓ نے مکران کا امیر بنا کر ان کو بھیجا تھا۔ اور یہ کافی عرصہ وہاں پر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اور مشہور روایت کے مطابق ملک شام میں داعی اجل کو لبیک کہا (۳۰)۔

۱۶۔ حضرت مجاشع بن مسعود بن ثعلبہ سلمیؓ: حضرت مجاشعؓ نے موجودہ افغانستان کے دارالحکومت کابل میں اسلامی فوج کے ایک دستے کی کمان کرتے ہوئے مخالفین اسلام سے جہاد کیا۔ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ہی پاکستان کے صوبے بلوچستان میں مخالفین اسلام سے جنگ کی اور اس سے ملحقہ علاقہ سجستان پر علم فتح لہرایا (۳۱)۔

۱۷۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرۃ قرشی تمیمیؓ: موصوف نے عراق اور فارس کی بعض جنگوں میں حصہ لیا۔ ۲۳ ہجری میں انہیں سجستان کا والی مقرر کیا گیا اور ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر بھی انہوں نے حملے کیے اور کچھ علاقوں کو فتح بھی کیا۔ زندگی کے آخری ایام بصرہ میں گزارے اور مشہور روایت کے مطابق ۵۱ ہجری کو وہیں فوت ہوئے (۳۲)۔

۱۸۔ حضرت خریت بن راشد ناجی سامیؓ: سنتیس ہجری میں حضرت علیؓ مسند خلافت پر فائز تھے تو حضرت خریت وارد مکران ہوئے۔ اس طرح ارض برصغیر کو ان کی قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی (۳۳)۔

۱۹۔ حضرت عبداللہ بن سوید تمیمیؓ: یہ صحابیؓ مخضرم تھے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں علاقہ سندھ کی ایک جنگ میں شریک ہوئے (۳۴)۔

۲۰۔ حضرت کلیب ابووائلؒ: ان کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں سرزمین برصغیر میں تشریف لائے تھے (۳۵)۔

۲۱۔ حضرت مہلب بن ابو صفرہ ازدیؒ: عہد معاویہ میں ۴۴ ہجری کو حضرت مہلبؒ فوجی کی حیثیت سے حدود ہند میں داخل ہوئے اور پھر برصغیر کے بعض دور دراز علاقوں کو پامال کرتے چلے گئے۔ اسی اثناء میں سندھ کے ایک شہر قندابیل کا رخ بھی کیا۔ بالآخر اس عظیم مرد مجاہد اور صحابی رسول نے ایران کے شہر مرو میں ۸۳ ہجری کو وفات پائی (۳۶)۔

۲۲۔ حضرت عبداللہ بن سوار بن حمام عبدیؒ: حضرت عبداللہؓ کو حضرت معاویہؓ نے ۴۳ ہجری میں ۴۰۰۰ فوج کے ساتھ حدود ہند کی طرف روانہ کیا۔ جہاں وہ جہاد میں مصروف رہے۔ بالآخر حضرت عبداللہؓ نے ۴۷ ہجری کو قلات میں ترک باشندوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا (۳۷)۔

۲۳۔ حضرت یاسر بن سوار بن حمام عبدیؒ: یہ حضرت عبداللہؓ کے بھائی تھے اور دور معاویہ میں ان کے ساتھ ہی حدود ہند میں جہاد میں شریک رہے (۳۸)۔

۲۴۔ حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؒ: حضرت معاویہؓ کی خلافت میں زیاد بن ابی سفیان نے ۵۰ ہجری میں ان کو جنگ کے لیے فوج کا امیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کے دور آخر میں ۵۹ ہجری کو وفات پائی (۳۹)۔

۲۵۔ حضرت منذر بن جارود عبدیؒ: حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں منذر کو اصطخر کا والی مقرر کیا تھا۔ پھر یزید بن معاویہ کے دور حکومت میں عبیداللہ بن زیاد کے کہنے پر ۶۰ ہجری میں حضرت منذر کو ہند کی سرحدوں کی طرف روانہ کیا گیا۔ بوقان، قلات اور خضدار کی جنگوں میں انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک روایت کے مطابق ۶۲ ہجری میں سندھ کے مفتوحہ علاقوں کی عمارت اور گورنری کا منصب ان کے سپرد رہا۔ اسی اثناء میں ان کی وفات ہوئی (۴۰)۔

اصحاب الحدیث کا اولین کارواں صحابہ کرامؓ کا تھا۔ جو وارد ہند ہوا۔ ان حضرات کا اصل مقصد اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق و کردار، صاف ستھری تہذیب و ثقافت اور تعلیم شائستگی کی ان بلند ترین اقدار

سے فیض یاب کرنا تھا جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔

سرزمین عجم پر فتوحات کا جو سلسلہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شروع ہوا وہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ۹۲ھ میں اموی دور حکومت میں مکمل ہوا جبکہ اس وقت ولید بن عبد الملک سلطنت اسلامی کے فرمانروا اور حجاج بن یوسف کوفہ کے گورنر تھے، حجاج کے بھتیجے محمد بن قاسمؒ نے ۱۷ سال کی عمر میں دیبل کے راستے سندھ میں داخل ہو کر سندھ کو فتح کیا۔ اس وقت سندھ پر ہندو بادشاہ راجہ داہر حکومت کر رہا تھا، اس معرکہ میں مسلمانوں نے سندھ کا ایک وسیع علاقہ فتح کیا اور راجہ داہر قتل کر دیا گیا، کثیر مقدار میں مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ سندھ میں اسلامی علوم کے آغاز اور ان کی اشاعت کے بارے میں سب سے پہلا اور باقاعدہ تحریری ثبوت محمد بن قاسمؒ کی فتح سندھ سے ملتا ہے۔ واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ عرب فوج میں قرآن مجید کے بہت سے قاری تھے جن کو حجاج نے یہ تاکید کی تھی کہ وہ قرآن کی قرأت پابندی سے کیا کریں (۴۱)۔

محمد بن قاسمؒ کے ہندوستان پر حملہ نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے مشن کو بہت تقویت پہنچائی تھی۔ برصغیر کے سندھ اور پنجاب کے خطوں میں دروس قرآن و حدیث کے عظیم مراکز و مدارس قائم ہوئے۔ جن میں جلیل القدر تابعین و تبع تابعین قرآن و حدیث و دیگر اسلامی علوم کی درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ محمد بن قاسمؒ نے موسیٰ بن یعقوب الثقفیؒ کو باقاعدہ درس حدیث پر مقرر فرمایا (۴۲)۔

اس طرح سندھ کی جانب سے برصغیر میں اسلام پہلی صدی ہجری میں داخل ہوا، اسی مناسبت سے سندھ کو "باب الاسلام" کہا جاتا ہے۔ سندھ فتح ہونے کے بعد اہل عرب کثرت سے سندھ میں آنے لگے اور اہل سندھ نے بھی عرب کی آمد و رفت شروع کر دی۔ اہل عرب اور اہل ہند کی آمد و رفت کے نتیجہ میں اہل ہند اور خصوصاً اہل سندھ کو علوم دینیہ کے حصول کا شوق و جذبہ پیدا ہوا اور اہل عرب سے قرآن و حدیث کے علوم حاصل کرنے شروع کیے۔ علوم دینیہ میں علم تفسیر اور حدیث کو خصوصی و امتیازی مرتبہ حاصل تھا، اس لیے انفرادی دروس کے علاوہ مراکز علم بھی قائم کیے گئے اور علماء بھی تیار ہوئے مثلاً ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن سندھیؒ یہ مشہور محدث اور معروف تبع تابعی تھے انہوں نے ابو امامہ سہل بن حنیفؓ کو دیکھا ہے۔ بے شمار تابعین کرام سے انہوں نے حدیث کا سماع کیا مثلاً: محمد بن کعب قرظی، نافع

مولی ابن عمر، سعید مقبری، محمد بن منکدر اور ہشام بن عروہ وغیرہ۔ اس سندھی محدث اور تبع تابعی کا رنگ سرخ، آنکھیں نیل گوں اور جسم بھاری بھر کم تھا۔ عباسی خلیفہ مہدی ان کو اپنے ساتھ عراق لے گیا تھا اور ایک ہزار دینار عطا کیے تھے۔ وہ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے ان سے لوگوں کو تعلیم دینے کی درخواست کی تھی، ابو معشر ۱۷۰ھ رمضان میں فوت ہوئے اور ان کی عمر نانوے سال تھی۔ اسی سال ہارون الرشید تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کا جنازہ پڑھایا اور ان کی موت پر حزن و ملال کا اظہار کیا۔ بغداد کے مقبرۃ الکبیرہ میں دفن کیے گئے (۴۳)۔ ابو عبداللہ محمد بن رجاء سندھیؒ (۴۴)۔ حافظ ابو بکر محمد بن محمد بن رجاء السندھیؒ (۲۸۶ھ / ۸۹۹ء) (۴۵) ۔ابو جعفر محمد بن ابراہیم دیبلیؒ (۲۳۲ھ / ۸۴۶ء)۔ دیبل کراچی کا نام تھا۔ جسے محمد بن قاسمؒ نے فتح کیا۔ اس کی فتوحات کے واقعات مشہور ہیں (۴۶)۔ ابو جعفر بن خطاب قصداریؒ (۴۷)۔ قصدار (قزدار) سندھ کا بڑا مشہور شہر تھا جسے مسلمانوں نے سنان بن سلمہؒ کی قیادت میں فتح کیا جو کہ علم حدیث کا بہت بڑا مرکز تھا (۴۸)۔

سندھ کے علاوہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ کی جانب سے سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۲ھ / ۱۰۰۲ء میں داخل ہو کر اسلام کے فروغ و اشاعت کی راہ ہموار کی۔ غزنوی عہد حکومت میں اسلام کی جڑیں لاہور اور گردونواح میں مستحکم ہو گئیں (۴۹)۔ سلطان محمود غزنوی کا حدیث رسول ﷺ سے بہت تعلق تھا وہ متبع سنت نبوی تھے۔ اور اس کو رائج کرنے کا ان کا بڑا رجحان تھا۔

برصغیر میں تابعین کی ایک کثیر تعداد تشریف لائی، جن کی تفصیل مشہور مؤرخ محمد اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔ ان میں سے ۴۲ تابعین کے اسماء ملتے ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں:

ابن اسید بن اخنسؒ (۵۰)، ابو شیبہ جوہریؒ (۵۱)، تاغر بن ذعر (۵۲)، حاتم بن قبیصہؒ (۵۳)۔ حکم بن منذر عبدیؒ (۵۴)، راشد بن عمرو بن قیس ازدیؒ (۵۵)، زائدہ بن عمیر طائی کوفیؒ (۵۶)، زیاد بن حواری عمیؒ (۵۷)، ابو قیس زیاد بن رباح بصریؒ (۵۸)، حکم بن عوانہ کلبیؒ (۵۹)، معاویہ بن قرہ مزنی بصریؒ (۱۱۳ھ) (۶۰)، مکحول بن ابو عبداللہ سندھیؒ (۱۱۳ھ) (۶۱)، عبدالرحمٰن بن عباسؒ (۶۲)، عبدالرحمٰن سندھیؒ (۶۳)، قطن بن مدرک کلابیؒ (۶۴)، قیس بن ثعلبہؒ (۶۵)، کہمس بن حسن بصریؒ (۱۴۹ھ) (۶۶) ، یزید بن ابو کبشہ سکسکی دمشقیؒ (۹۶ھ) (۶۷)، موسی سیلانیؒ (۶۸)، موسی بن یعقوب ثقفیؒ (۶۹)، عبدالرحمٰن کندیؒ (۷۰)، عبدالرحمٰن بیلمانیؒ (۷۱)، عمر بن عبید اللہ قرشی تیمیؒ (۷۲)، شمر بن عطیہ بن عبدالرحمٰن اسعدیؒ (۷۳)، سعید بن اسلم کلابیؒ (۷۴)، سعید بن کندیر

قشیریؒ (۷۵)، سعد بن ہشام انصاریؒ (۷۶)، عبدالرحمٰن بن عبداللہؒ (۷۷)، حارث بن مرہ عبدیؒ (۷۸)، حارث بیلمانیؒ (۷۹)، ایوب بن زید ہلالیؒ (۸۴ھ) (۸۰)، حری بن حری باہلی (۸۱)، عباد بن زیاد بن ابوسفیانؒ (۱۰۰ھ) (۸۲)، یزید بن مفرح حمیریؒ (۶۹ھ) (۸۳)، ربیع بن صبیح سعدی، بصریؒ (۱۶۰ھ) (۸۴)، مجاعہ بن سعر تمیمی (۸۵)، عطیہ بن سعد عوفیؒ (۱۱۱ھ) (۸۶)، حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) (۸۷)، صیفی بن فسل شیبانیؒ (۵۲ھ) (۸۸)، ابوسلمہ زطیؒ (۸۹)، محمد بن قاسمؒ، حباب بن فضالہ ذہلی (۹۰)۔

تمام تابعین عظام قرآن و سنت کے شیدائی تھے ان کے زمانہ میں قال اللہ و قال الرسول ﷺ کے علاوہ کوئی آواز ہی نہ آتی تھی کیونکہ مروجہ مذاہب اربعہ یا دوسرے ظاہری مذہب وغیرہ کا نام نشان ہی نہ تھا۔

برصغیر میں تبع تابعینؒ:

برصغیر میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی طرح کثیر تعداد میں تبع تابعین بھی تشریف لائے۔ لیکن جن کے نام و حالات تاریخ نے محفوظ کیے، ان کی تعداد تابعینؒ کی نسبت تھوڑی ہے۔ ان صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے اسلام کے ابتدائی عہد میں برصغیر کا عزم کیا اور انہیں کی کوششوں سے اسلام اور علم حدیث برصغیر تک پہنچا۔

ابتدائی چار صدیوں میں ہندوستان میں لوگوں کا رجحان صرف حدیث نبوی کی طرف تھا کیونکہ جب اسلام ہندوستان میں داخل ہوا تو قرآن و حدیث کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ لوگ علماء اور محدثین کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ابوالقاسم مقدسیؒ جس نے سلطان محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے ۳۷۵ھ میں سندھ کو دیکھا۔ وہ اس خطہ کے متعلق لکھتا ہے: "ان میں سے اکثر لوگ حدیث کی طرف رجحان رکھنے والے ہیں"(۹۱)۔

اوائل صدیوں میں عرب سے آنے والے مشہور محدثین کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ موسیٰ بن یعقوب الثقفیؒ (۹۲)　　۲۔ یزید بن ابی کبشہ دمشقی (۹۳)

۳۔ ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصریؒ (۹۴)　　۴۔ ابوحفص ربیع بن صبیحؒ (۹۵)

چوتھی صدی ہجری کے دوسرے نصف حصہ میں سندھ پر اسماعیلیوں کی حکومت کے قیام سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے وسط تک زیریں سندھ میں اسماعیلیوں کا اثر کسی نہ کسی شکل میں مسلسل باقی

رہا۔ سندھ پر عربوں کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جو حالات رونما ہوئے۔ ان میں سے عرب ممالک اور بالخصوص حجاز میں واقع علم حدیث کے مراکز سے سندھ کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس طرح جنوبی ہند میں علم حدیث کا احیاء کرانے میں بھی تاخیر ہو گئی۔

سندھ میں عرب حکومت کمزور پڑ جانے کے بعد شمال مغربی سرحدی جانب سے جب غزنویوں اور غوریوں کی حکومت یہاں قائم ہوئی تو براہ راست محدثین کی آمد و رفت کم ہو گئی ان کی بجائے خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے علما یہاں فروکش ہوئے۔ اس دور میں مذاہب اربعہ کا رواج بھی کسی قدر پڑ چکا تھا اور یہ فاتحین بھی حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ساتھی فقہائے کرام کا تعلق علم حدیث سے بہت کم تھا جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے صراحت کی ہے۔ **"واشتغالهم بعلم الحديث قليل قديما وحديثا"** [۹۶] ترجمہ: ان کی قدیم اور جدید زمانہ میں علم حدیث کے ساتھ مشغولیت کم تھی۔

سید عبدالحئ حسنیؒ حنفی لکھتے ہیں: ۶۵۶ھ میں سقوط بغداد کے بعد برصغیر میں حدیث کی طرف رجحان کم رہا زیادہ تر ادب، شعر، فقہ، اصول فقہ، ریاضی اور یونانی علوم کی طرف رجحان کرتے تھے۔ حدیث کی طرف ان کا اتنا ہی رجحان تھا جس قدر احادیث فقہ کی کتب میں آجاتی تھیں۔ ان کی نظر صرف صغانی کی کتاب مشارق الانوار کی طرف ہوتی تھی اور اگر کوئی مصابیح السنہ یا مشکوٰۃ پڑھ لیتا تو اسے محدث سمجھا جاتا تھا۔ ایسا ان کے علم حدیث سے ناواقفیت کی بناء پر تھا۔ وہ حدیث کی کتب کو نہ پڑھتے تھے نہ جانتے تھے اور نہ ہی محدثین کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ مشکوٰۃ کو بھی علم اور فہم کے لیے نہیں بلکہ برکت کے لیے پڑھا جاتا تھا۔ وہ تقلید کے قائل تھے اور تحقیق کی طرف ان کا میلان نہیں تھا اس لیے یہاں زیادہ تر ایسے فتاویٰ دیے جاتے تھے جن میں فقہ کو احادیث پر فوقیت دی جاتی۔ جب دسویں صدی ہجری میں یہاں علمائے محدثین تشریف لائے تو حدیث کی طرف رجحان شروع ہوا [۹۷] اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ شیخ شمس الدین ترک جب آٹھویں صدی ہجری میں سلطان علاؤ الدین خلجی کے دور میں وارد ہند ہوئے تو یہاں کے حالات کے متعلق سلطان وقت سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں۔

> "میں نے سنا ہے کہ تمہارے شہر میں احادیث مصطفیٰ ﷺ کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور فقیہوں کی روایت پر عمل کی دیواریں استوار کی جاتی ہیں، تعجب ہے کہ جس شہر

میں لوگ حدیث کی موجودگی میں فقہ کی روایت پر عمل کریں تو وہ شہر تباہ کیوں نہیں ہو جاتا اور اس پر آسمانی مصائب کیوں نہیں پھوٹنے لگتے" (۹۸)۔

سید سلیمان ندویؒ نے عہد تغلق میں علم حدیث کے متعلق لکھا ہے:

"اس عہد میں علم حدیث کے ساتھ لوگوں کو جو بے اعتنائی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدینؒ کے زمانہ میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی۔ مناظرہ کے ایک فریق شیخ نظام الدینؒ سلطان الاولیاء تھے اور دوسری طرف تمام علماء۔ شیخ کا بیان ہے کہ جب میں کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو علماء بڑی جرأت اور بے باکی سے کہتے کہ اس ملک میں حدیث پر فقہی روایت مقدم سمجھی جاتی ہے اور کبھی یہ کہتے کہ چونکہ اس حدیث سے شافعیؒ نے استدلال کیا ہے اور وہ ہمارا مخالف ہے اس لیے ہم اس حدیث کو نہیں مانتے"(۹۹)

اس عمومی حالت کے باوجود یہاں خال خال شخصیات ایسی بھی نظر آتی ہیں جنہوں نے اس بے اعتدالی اور جمود کو قبول نہیں کیا۔ ان میں نامور علماء یہ ہیں:

شیخ حسن بن محمد صنعانیؒ: موصوف کی کنیت ابو الفضائل ہے۔ آپ کا خاندان ماوراء النہر اور غزنین سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر والد محترم نے ہندوستان سکونت اختیار کرلی تھی۔ آپ ۵۵۷ھ لاہور میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کے اعتبار سے صغانی اور مؤلد کے اعتبار سے لاہوری معروف ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد محترم سے حاصل کی۔ اور تکمیل حجاز، یمن اور عراق کے شیوخ سے کی۔ اپنے وقت کے عظیم محدثین وفقہاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف کا دائرہ، حدیث، فقہ اور لغت تک وسیع ہے۔ جن کی تعداد دور دور جن کے قریب ہے۔ جن میں سب سے مشہور "مشارق الأنوار النبویۃ من صحاح الاخبار المصطفویۃ" ہے۔ جو صحیحین کی صرف قولی احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ہندوستان میں مولانا خرم علی بلہوری المتوفی ۱۲۷۰ھ کے ترجمہ اور تشریح کے ساتھ لکھنو سے ۱۲۵۲ھ میں شائع ہوئی۔ (۱۰۰)

علی المتقیؒ: ان کا مکمل نام علی بن حسام الدین بن عبد المالک المتقی ہے۔ جو کہ ۸۸۵ھ کو برہان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہاں سے حاصل کی پھر ملتان میں شیخ حسام الدین المتقی کے ہاں دو سال رہ کر علوم کی تکمیل کی۔ غالباً المتقی کا لقب انہیں استاد کی نسبت سے حاصل ہوا۔ حدیث کا معروف دائرۃ المعارف

جو کہ "کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال" کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ہی کی تصنیف ہے۔ ان کی وفات ۹۷۵ھ میں ہوئی [۱۰۱]۔

شیخ محمد طاہر پٹنیؒ: "پٹن" احمد آباد کے پاس ایک قصبہ کا نام ہے اور اب تک آباد ہے۔ اسی ٹپن میں پیدا ہونے والے شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے نام سے مشہور ہوئے۔ موصوف کی حدیث میں بہت سی خدمات ہیں مثلاً: مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزیل ولطائف الأخبار، تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات، مغنی فی اسماء الرجال" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ اور مطبوع ہیں۔ موصوف ۹۸۶ھ کو دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ [۱۰۲]

شیخ ابو الحسن سندھیؒ: موصوف کا نام محمد، کنیت ابو الحسن اور لقب نور الدین تھا۔ سندھ کے مرکز علم ٹھٹہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر حجاز مقدس کا سفر کیا اور حصول تعلیم کے بعد حرم نبوی ہی میں تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ ان کی تصنیفات میں الصحاح ستہ پر حواشی کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ بالآخر ۱۱۳۸ھ کو موصوف رحلت فرما گئے [۱۰۳]۔

شیخ محمد حیات سندھیؒ: موصوف ۱۲ صدی ہجری کے نامور محدثین میں سمجھے جاتے ہیں جو کہ سندھ کے ضلع سکھر کے علاقہ عادل پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہاں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے حجاز پہنچ گئے۔ مولانا ابو الحسن سندھی کی وفات کے بعد انہیں کے جانشین بنے اور ان کی مسند پر ۲۴ سال حدیث کا درس دیتے رہے۔ ان کی تصنیفات میں : الایقاف علی سبب الاختلاف" اور "تحفۃ الأنام فی العمل بحدیث النبی ﷺ" کے نام مشہور ہیں۔ موصوف ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ کو مدینہ منورۃ میں فوت ہوئے [۱۰۴]

آخری دور میں **شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی** نے بھی اپنی تعلیمات کی بنیاد کشف والہام اور مشرب مرشد کی بجائے کتاب و سنت پر رکھی۔ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں۔ "حضرت مجدد نے اپنی تعلیم کی بنیاد اتباع سنت پر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہونے لگی [۱۰۵]۔

برصغیر میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ جس میں محدثین عظام نے علم حدیث کی آبیاری نہ کی تاہم ان میں سے مشہور یہ ہیں:۔

شیخ احمد سرہندیؒ: موصوف ۱۵۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے سیالکوٹ، کشمیر وغیرہ کا سفر کیا۔ شیخ نے حدیث کے میدان میں گراں قدر

خدمات سرانجام دیں، اور پھر بالخصوص انہوں نے مسلمانوں کو جمود کے خاتمے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کی بہت رغبت دلائی۔ اسی مناسبت سے ان کا ایک رسالہ "اربعین" کے نام سے منظر عام پر ہے۔ شیخ نے ۶۳ سال کی عمر میں ۱۶۲۴ء کو وفات پائی (۱۰۶)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ: یہ جنوری ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد ماجد سے حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے مکہ مکرمہ کا سفر کیا۔ ۱۵۹۲ء کو حصول تعلیم کے بعد ہندوستان واپس آئے تو ایک مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ جس میں تدریس حدیث کے علاوہ حدیث پر تحریری کام بھی بہت کیا۔ مثلاً مشکوٰۃ کی دو شرحیں ایک فارسی زبان میں اشعۃ اللمعات اور دوسری عربی زبان میں لمعات التنقیح لکھیں۔ فارسی شرح کے مقابلے میں مشکوٰۃ کی عربی شرح زیادہ واضح اور مفصل ہے، نیز مشکوٰۃ کے ہی حوالے سے ایک اور کتاب جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ مرتب کی، جس میں مشکوٰۃ کے ہر ایک باب سے ایک یا دو حدیثوں کو اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ، ترجمۃ أحادیث الأربعین، الأحادیث فی ابواب علوم الدین اور دستور فیض النور وغیرہ کتب حدیث بھی موصوف کی ہیں۔ آپ نے ۹۱ سال کی عمر میں ۱۶۴۲ء کو وفات پائی (۱۰۷)۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ: شاہ ولی اللہؒ ۱۱۱۴ھ کو پید ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی علاقے کے بزرگ علماء سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے حرمین شریفین کا سفر کیا۔ ۱۱۴۳ھ کو ہندوستان واپس آکر خدمت حدیث میں مصروف ہوگئے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی زندگی کے ۱۷ سال کی عمر میں ہی تدریس کا آغاز کر دیا۔ اس اعتبار سے تدریس حدیث کے علاوہ حدیث کے میدان میں تحریری شکل میں بھی نمایاں کام سرانجام دیا ہے۔ مثلاً المسویٰ (عربی) اور المصفی (فارسی) مؤطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ نیز حجۃ اللہ البالغۃ، الإنصاف فی سبب الإختلاف، مجموعۃ رسالۃ اربعۃ، الدر الثمین فی مبشرات النبی الأمین، تاویل الأحادیث فی رموز قصص الأنبیاء اور مسلسلات کے نام سے مختلف کتب حدیث کو تالیف کیا۔ بالآخر شاہ ولی اللہؒ ۲۹ محرم ۱۱۷۶ء بمطابق ۲۱ اگست ۱۷۶۲ء کو ۶۲ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے (۱۰۸)۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ: شاہ عبدالعزیز ۱۷۴۷ء کو علمی خاندان شاہ ولی اللہؒ کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے خدمت حدیث کے اس بابرکت کام میں حصہ ڈالنے کے لیے بستان المحدثین کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب تحریر کی، عجالہ نافعہ بھی حدیث پر ان کی کتاب ہے، جس میں محدثین کے

حالات درج ہیں۔ شاہ عبدالعزیز بروز اتوار ۱۸۲۴ء کو ۷۷ سال کی عمر میں اس دنیا فانی سے کوچ فرما گئے [۱۰۹]۔ بعض تذکرہ نگار انہیں برصغیر میں علم حدیث کے بانی قرار دیتے ہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے برصغیر میں علم کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا ہے اور علم حدیث رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی [۱۱۰]۔

برصغیر کے مسلمانوں نے اسلامی علوم کے فروغ کے سلسلہ میں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور ادب میں قابل تعریف کارنامے انجام دیئے ہیں۔ علمائے برصغیر نے دیگر علوم کی طرح علم حدیث کے فروغ کا اہتمام کیا اور کتب حدیث، صحاح ستہ، مسانید اور معاجم وغیرہ کے ترجمہ و تشریح اور تحقیق و تخریج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس وقت ہمیں ان کتب حدیث کی بہت سی شروحات ملتی ہیں۔ یہ علمائے برصغیر کی علم حدیث کے ساتھ والہانہ عقیدت کا بین ثبوت ہے۔ جن میں نمایاں نام یہ ہیں۔

نواب سید صدیق حسن خانؒ: نواب صاحب ہندوستان کے شہر بانس بریلی میں ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد حدیث کے میدان گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ موصوف نے عربی، فارسی اور اردو میں دوسو بائیس کے قریب کتابیں لکھیں جن میں سے علم حدیث پر چند کتابیں یہ ہیں:

عون الباری شرح تجرید بخاری، مسک الختام شرح بلوغ المرام (فارسی)، منہج الوصول (فارسی)، ھدایۃ السائل، الروضۃ الندیۃ شرح درر البھیۃ، فتح المغیث، موائد العوائد وغیرہ۔ سید صاحب 58 سال کی عمر میں فروری ۱۸۹۰ء کو بھوپال میں وفات پاگئے [۱۱۱]۔

سید نذیر حسین دہلویؒ: سید نذیر حسین دہلوی صاحب بہار کے ضلع مونگھیر میں پیدا ہوئے۔ موصوف کی تصنیف و تالیف کی تعداد ۵۷ ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: معیار الحق، ثبوت الحق، واقعات الفتوی ودافعۃ البلوی، فلاح الولی فی اتباع النبی ﷺ اور فتاویٰ نذیریہ وغیرہ۔ اپنے استاد شاہ محمد اسحاق نواسہ شاہ عبدالعزیز کے بلد و حجاز میں جانے کے بعد انہوں نے مسند حدیث سنبھالی۔ میاں صاحب ۱۰۰ سال کی عمر میں ۱۹۰۲ء کو دہلی میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے [۱۱۲]۔

رشید احمد گنگوہیؒ: موصوف سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ مولانا کو تذکرۃ الرشید کی وجہ سے بہت شہرت ملی۔ ترمذی پر آپ کی تقاریر کا مجموعہ الکوکب الدری کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہے۔ فتاویٰ رشیدیۃ سبیل

الرشاد وغیرہ بھی آپ ہی کی کتب ہیں۔ آپ ۱۹۰۵ء کو تقریباً ۷۸ سال کی عمر میں دنیا فانی کو خیر باد کہہ گئے (۱۱۳)۔

مولانا شمس الحق ڈیانویؒ: مولانا ۱۸۵۶ء کو اعظم آباد کے قصبہ ڈیانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے حدیث کے میدان میں بہت شہرت حاصل کی۔ کتب حدیث میں سے غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد، القول الحق، عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، التعلیق المغنی علی کتاب سنن الدار قطنی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ آپ نے ۱۲/ مارچ ۱۹۱۱ء کو وفات پائی (۱۱۴)۔

مولانا عبدالجبار غزنویؒ: موصوف ۱۸۵۱ء کو غزنی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مدرسہ غزنویہ کی بنیاد رکھی، جہاں حدیث کی تدریس میں بہت بلند نام پیدا کیا۔ مولانا ۱۹۱۲ء کو فوت ہو گئے (۱۱۵)۔

حافظ عبدالمنانؒ وزیر آبادی: حافظ صاحب اعوان خاندان میں ۱۸۵۰ء کو سیداں ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ مولانا نے سید نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث پڑھنے کے بعد وزیر آباد میں دارالحدیث کی بنیاد رکھی اور ۲۴ سال تک تفسیر و حدیث کا درس دیتے رہے۔ اور ۳۵ مرتبہ پوری صحاح ستہ پڑھائی۔ تصنیف و تالیف کی بجائے تدریس کے ذریعے مولانا موصوف نے برصغیر میں علم حدیث کی اشاعت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی (۱۱۶)۔

مولانا وحید الزمانؒ: مولانا کانپور میں ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوئے۔ خدمت حدیث میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں ان میں سے حدیث کے موضوع پر درج ذیل کتابیں مشہور ہیں: کشف المغطا عن المؤطا لترجمۃ مؤطا امام مالک، الھدی المحمود لترجمۃ سنن ابی داؤد، المعلم لترجمۃ صحیح مسلم، تسھیل القاری شرح اردو صحیح بخاری، رفع العجاجۃ عن ترجمۃ سنن ابن ماجۃ، روض الرمی من ترجمۃ المجتبی (سنن نسائی کا ترجمۃ)۔ وحید الزمان صاحب ۱۵/ مئی ۱۹۲۰ء کو حیدر آباد میں صدائے ربانی پر لبیک کہہ گئے (۱۱۷)۔

انور شاہ کشمیری: شاہ صاحب ۱۸۷۵ء کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ خدمت حدیث کی مناسبت سے ترمذی کی شرح العرف الشذی کی وجہ سے حدیث میں ان کو شہرت ملی۔ آپ ۱۹۳۴ء کو ۶۰ سال کی عمر میں دیوبند میں فوت ہوئے۔(۱۱۸)

خلیل احمد سہارنپوریؒ: خلیل احمد سہارنپوری ۱۸۵۲ء کو سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ خدمت حدیث میں سنن ابی داؤد کی شرح بذل المجہود لکھی۔ آپ نے ۱۹۲۷ء کو وفات پائی، اور بقیع الغرقد میں دفن ہوئے[۱۱۹]۔

حافظ عبدالرحمٰن محدث مبارکپوریؒ: آپ ۱۸۶۶ء کو مبارک پور میں پیدا ہوئے۔ حدیث کا علم سید نذیر حسین محدث دہلوی سے حاصل کیا۔ خدمت حدیث کی مناسبت سے سنن ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی کی وجہ سے شہرت پائی۔ اور پورے عالم اسلام میں مشہور ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء کو کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد وفات پاگئے[۱۲۰]۔

حافظ محمد گوندلویؒ: آپ گوجرانوالہ کے نواح گوندلانوالہ میں ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ پھر اپنی زندگی کے تقریباً ۶۰ سال تدریس حدیث میں صَرف کیے۔ مولانا نے حدیث کی تدریس کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں دو سال کا عرصہ تدریس میں گزارا۔ آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ چند ایک کتب حدیث یہ ہیں: تقاریر صحیح بخاری، شرح مشکوٰۃ المصابیح (عربی)، درس صحیح بخاری، الاصلاح، مقالات حافظ محمد گوندلوی اور دوامِ حدیث وغیرہ اس کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر بیس سے زائد کتب لکھیں۔ ۱۹۸۵ء میں فوت ہوئے[۱۲۱]۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ: مولانا امرتسر کے قصبہ بھوجیان میں ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ ایک بلند پایہ مصنف اور مؤلف کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ کتب حدیث کی مناسبت سے سنن نسائی کی شرح التعلیقات السلفیہ، فیض الودود تعلیق علی سنن ابی داؤد، پیارے رسول کی پیاری دعائیں جیسی کتب تالیف کیں۔ آپ تین اکتوبر ۱۹۸۷ء کو فوت ہوئے، اور لاہور کے قبرستان میں مدفون ہیں۔[۱۲۲]

حدیث کی نشرواشاعت میں اہم کردار علماء کے ساتھ ساتھ مراکز حدیث کا بھی ہے۔ کیونکہ مراکز حدیث ایک ایسے بنیادی ادارے ہوتے ہیں جن سے بہت باوقار اور بلند عزم و ہمت والی شخصیتیں جنم لیتی ہیں جو حالات کے رخ کو بدلنے میں بہت نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ مراکز حدیث آغاز اسلام سے اب تک مختلف صورتوں میں اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ اس کی جدید ترین شکل ایک باقائدہ تعلیمی ادارے کی ہے، جہاں شب و روز سینکڑوں حدیثوں کی تدریس، افہام و تفہیم اور ان پر عمل کا کام جاری ہے۔ برصغیر کے نمایاں مراکز حدیث میں ادارۃ العلوم الاثریہ، فیصل آباد، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، جامعہ

اسلامیہ، گوجرانوالہ، جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ، جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، تقویۃ الاسلام، لاہور، جامعہ رحمانیہ، لاہور، جامعہ نعیمیہ، لاہور، جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ خیر المدارس ملتان، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعہ علوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ محمدیہ اوکاڑہ، دارالحدیث رحمانیہ دہلی، دارالحدیث وزیر آباد اور مدرسہ رحیمیہ دہلی قابل ذکر ہیں (۱۲۳)۔

برصغیر کے علوم اسلامیہ کے نصاب کو مولانا ابوالحسنات ندوی حنفی نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے جن کے مطابق پہلا دور بارہویں صدی عیسوی اور پندرہویں صدی عیسوی کے درمیان تقریباً ۲۰۰ سال تک رہا۔ اس میں علوم عقلیہ کو فوقیت تھی حدیث میں صرف مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ شامل نصاب تھیں۔ دوسرا دور ایک صدی پر محیط ہے جس میں یہی نصاب رائج رہا۔ تیسرے دور جو کہ شاہ ولی اللہؒ کی وفات تک محیط ہے اس میں مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور صحیح بخاری شامل نصاب ہو گئیں۔ پھر دور چہارم میں صرف حدیث کی کتاب مشکوٰۃ المصابیح شامل نصاب رہی۔ دور پنجم ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد شروع ہوا۔ اس نصاب میں کتب حدیث کا بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ جس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، مؤطا، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ شامل ہو گئیں (۱۲۴)۔

عصر حاضر کے درس نظامی کے نصاب میں حدیث کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے مدارس سلفیہ میں کتب صحاح اور دیگر کتب حدیث کو بالاستیعاب پڑھایا جاتا ہے، اور پھر افہام و تفہیم کے لیے بھی اچھا خاصا وقت صرف کیا جاتا ہے۔ نیز جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں باقاعدہ حدیث و سیرت میں ایم۔اے کروایا جاتا ہے اور پھر ہر یونیورسٹی کے ایم۔ اے علوم اسلامیہ میں حدیث کا پرچہ باقاعدہ شامل ہے (۱۲۵)۔

برصغیر کے تدریس اسالیب حدیث میں جو طریقہ مروج ہے اس میں مطالعہ، قرأۃ، سماع، مباحثہ، اعادہ، پڑھنے کی مشق اور املا جیسے ارکان شامل ہیں۔ جس سے حدیث کے افہام و تفہیم اور عربی متن کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

پاک و ہند میں مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر تدریس و ترویج حدیث کی سعادت شاہ ولی اللہؒ کی ذات گرامی کا مقدر تھی۔ آپ نے یہاں معقولی و منقولی نظام تعلیم میں پرورش پائی لیکن جب زیارت حرمین کی اور وہاں علم حدیث کو حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تو مسلکی تعصب کی جگہ بین المسالک

تطبیقی فکر نے لی اور اسی وجہ سے آپ نے مؤطا کی دو شرحیں المسویٰ (عربی) اور المصفیٰ (فارسی) میں لکھیں۔ اور حجۃ اللہ البالغہ میں اس کو صحیحین کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور فکر محدثین کی طرف رجوع کی طرف تلقین کی۔ اس مشن اور فکر کو لے کر آپ کا خاندان آگے بڑھا یہاں پر دارالحدیث کا قیام اور کتب حدیث کی تدریس میں اضافہ کا سہرا اپنے سر باندھا۔ پھر اسی مشن کو شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی نے چار چاند لگا دیئے۔ بقول سید سلیمان ندویؒ کے مدت کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا اور یہ جو خیال ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے، رفع ہو گیا اور لوگ از سر نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی۔ اور قیل و قال کے مکدر گڑھوں کی بجائے ہدایت کے اصلی سرچشمہ مصفیٰ کی طرف واپسی ہوئی" (۱۲۶)۔

برصغیر میں چودھویں صدی ہجری تک علماء ہاتھ سے لکھ کر کتب حدیث پھیلاتے تھے۔ ان میں علم حدیث اور دیگر علوم (عموما عربی، اردو اور فارسی زبان) کے گراں قدر لٹریچر شامل ہیں۔ تیرہویں صدی ہجری کے اختتام اور چودھویں صدی کے آغاز میں علمائے برصغیر نے اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے چھاپے خانے قائم کئے اور اسلام علوم خصوصا علم حدیث کی اہم اور نادرونایاب کتابیں طبع کیں۔ ان مطابع سے بہت سی مفید کتابیں چھپ کر منظر عام پر آگئی۔ لیکن بعض لٹریچر اب تک مخطوطات کی شکل میں ہیں۔

برصغیر میں بہت سے اہل علم اور ادارے ایسے ہیں جنہوں نے ان تصانیف کو مخطوطات کی شکل میں محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱) طبری، محمد بن جریر، جامع البیان المعروف تفسیر طبری المکتبہ التجاریہ، القاہرہ ص: ۳۸/۲

۲) صدیقی، زبید احمد، ڈاکٹر، عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ ،ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۳۱

۳) محمد اسلم سیف، قاضی، تحریک اہلحدیث تاریخ کے آئینہ میں ،مکتبہ تعلیمات اسلامیہ، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۷

۴) نسائی، احمد بن شعیب، السنن ،دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء، ص:۱۳۸، رقم الحدیث:۳۱۷۳

۵) بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ، ۱۹۵۹ء، ص:۸۴

۶) ندوی، سید سلیمان، عربوں کی جہاز بانی ،اسلامک کلچر، حیدر آباد، دکن، ص:۵۲

۷) غازی، محمود احمد، محاضرات حدیث الفیصل ناشران کتب، لاہور، ۲۰۰۴ء ص:۴۱۳

۸) رازی، عبدالرحمان بن ابی حاتم، کتاب الجرح والتعدیل ،دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۵۲ء، ص:۸

۹) ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل، البدایہ والنہایہ، مکتبۃ المعارف، بیروت ۱۹۸۳ء، ص: ۸۸/۹

۱۰) ایس ایم ناز، ڈاکٹر، شاہ ولی اللہ اور علم حدیث، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء، ص:۱۵۶

۱۱) محمد اسحاق، ڈاکٹر، علم حدیث میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور،، ص:۲۷

۱۲) ایضاً، ص:۳۴

۱۳) بھٹی، محمد اسحاق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص:۴۶

۱۴) ایضاً، ص:۴۷۔ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد بن سعید، جمہرۃ انساب العرب ،دارالمعارف، مصر ۱۳۸۲ھ، ص:۲۶۶

۱۵) مبارکپوری، اطہر، قاضی، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عارفین، کراچی، ص:۱۷-۲۷

۱۶) ابن حجر، احمد بن علی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، طبع مصر، ص: ۲۸/۸

۱۷) ابن العماد، عبدالحئ، شذرات الذہب، مکتبۃ القدس، القاہرہ ۱۳۵۰، ص: ۵۵/۱

۱۸) ابن سعد، محمد، الطبقات الکبریٰ ،دار صادر، بیروت۔ ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء ص:۱۸۰/۷، مبارکپوری، خلافت راشدہ اور ہندوستان، تخلیقات۔لاہور ۲۰۰۴ء، ص:۱۷۸

۱۹) طبری، تاریخ الامم والملوک المعروف تاریخ طبری ،دارالمعارف۔القاہرہ ۱۹۶۳ء، ص: ۱۸۱/۴

۲۰) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ،ص: ۱۷۷/۱۰

۲۱) طبری، ابن جریر، تاریخ طبری ص: ۴/۱۸۲

۲۲) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ،ص: ۱۰/۱۹۹

۲۳) طبری، تاریخ طبری ص: ۴/۱۸۲

۲۴) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ،ص: ۱۰/۱۷۶

۲۵) طبری، تاریخ طبری ص:۴/۱۸۰

۲۶) مبارکپوری، خلافت راشدہ اور ہندوستان، ص:۲۶۳

۲۷) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص۷۸

۲۸) طبری، تاریخ طبری ص: ۴/۲۶۴

۲۹) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۷۹

۳۰) ایضاً، ص:۸۰

۳۱) ایضاً، ص:۸۱

۳۲) ابن حجر، الاصابہ فی تمییزالصحابہ، ص: ۲/۴۹

۳۳) ایضاً، ص: ۵/۹۳

۳۴) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۸۳

۳۵) مبارکپوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۷۶

۳۶) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۸۵

۳۷) ایضاً، ص:۸۵

۳۸) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۸۵

۳۹) ابن حجر، الاصابہ فی تمییزالصحابہ، ص: ۶/۱۶۰

۴۰) مرزا قلیچ بیگ، بچ نامہ، مترجم انگلش، فریدون بیک کراچی، ص:۷۸

۴۱) عبدالحئ حسنی، نزہۃ الخواطر ،دائرۃ المعارف، حیدر آباد، بھارت، ص: ۱/۳۵

۴۲) ایضاً، ص: ۱/۳۵

۴۳) مبارکپوری، رجال السند والہند، المطبعۃ الحجازیۃ، بمبئی، ۱۹۵۸ء، ص:۲۱۷

۴۴) ایضاً، ص:۳۳۶

۴۵) ایضاً، ص:۲۰۴

۴۶) ایضاً، ص:۸۹

۴۷) ایضاً، ص:۳۳

۴۸) فریوائی، عبدالرحمٰن بن عبدالجبار، جہود مختصہ فی خدمۃ السنۃ، الجامعہ السلفیہ بنارس، ہند ۱۴۰۶ھ، ص:۳

۴۹) ابن حزم جمہرۃ انساب العرب ص۲۶۸، بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۹۰

۵۰) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۹۰

۵۱) مرزا قلیچ بیگ، چچ نامہ، ص:۹۹

۵۲) ابن حزم، جمہرۃ انساب العرب، ص:۲۹۶

۵۳) ایضاً، ص:۲۹۶

۵۴) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۹۲

۵۵) ایضاً، ص:۹۲

۵۶) ایضاً، ص:۹۳

۵۷) ابن حزم، جمہرۃ انساب العرب، ص:۲۵۹

۵۸) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۹۵

۵۹) ایضاً

۶۰) ایضاً،ص:۹۵

۶۱) بخاری، محمد بن اسماعیل، تاریخ الکبیر ،حیدر آباد دکن، ہند،ص: ۲/۲۹۵

۶۲) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص۹۶

۶۳) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۹۷

۶۴) ابن حجر، تہذیب التہذیب،ص:۸/۴۵۰

۶۵) ابن حزم، جمہرۃ انساب العرب، ص:۴۳۲

۶۶) مبارکپوری،ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۷۰

۶۷) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۹۷

۶۸) ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ،دارالکتاب العربی،بیروت،۲۰۰۶ء،ص: ۴/۴۷

۶۹) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۱۰۰ایضاً

۷۰) ابن حزم، جمہرۃ انساب العرب، ص:۲۸۷

۷۱) ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ،ص: ۳۶/۴

۷۲) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۱۰۲

۷۳) بخاری، تاریخ الکبیر،ص: ۷۶/۲

۷۴) بھٹی، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۱۰۴

۷۵) ایضاً،ص:۱۰۴

۷۶) ایضاً،ص:۱۰۵

۷۷) ابن خلکان،احمد بن محمد، وفیات الاعیان،مکتبة النضهة المصری ةالقاہرہ،۱۹۴۸ء،ص: ۲۳۰/۱

۷۸) بلاذری، فتوح البلدان، ص:۴۲۲

۷۹) ابن خلکان، وفیات الأعیان،ص: ۳۸۴/۵

۸۰) بھٹی،برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، ص:۱۰۷

۸۱) معارف، ماہنامہ، اعظم گڑھ۔اکتوبر ۱۹۲۸ء، (ج۲۲، ش۴) ص:۲۵۱

۸۲) ابن حجر، تہذیب التہذیب ص: ۲۴۸/۳

۸۳) مبارکپوری،رجال السند والہند،ص:۱۰۹

۸۴) مبارکپوری،خلافت راشدہ اور ہندوستان، ص:۲۵۴

۸۵) طبری،تاریخ طبری ص: ۲۷۱/۵

۸۶) بلاذری، فتوح البدان، ص:۳۶۹

۸۷) ابن اثیر، الکامل، ص:۱۳۱/۴

۸۸) ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد، امام، میزان الاعتدال ،دارالمعرفہ، بیروت۔، ص:۴۴۸/۱

۸۹) فریوائی، جہود مخلصہ، ص:۲۱

۹۰) عبدالحئ حسنی، نزھۃ الخواطر ص:۳۵/۱

۹۱) فریوائی، جہود مخلصہ، ص:۱۴

۹۲) ایضاً، ص:۱۸

۹۳) ایضاً، ص:۲۴

۹۴) شاہ ولی اللہ، الانصاف، ص:۷۷

۹۵) فریوائی، جہود مخلصہ، ص:۳۶

۹۶) بھٹی، فقہائے ہند، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص: ۱/۲۲۳

۹۷) ندوی، سید سلیمان، مقالات سید سلیمان ندوی، ص:۲/۳۰

۹۸) عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر، ص:۱/۱۳۷

۹۹) اثری، ارشاد الحق، پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات حدیث، ادارۃ العلوم الاثریۃ فیصل آباد، ۲۰۰۱ء، ص:۱۵

۱۰۰) ایضاً، ص:۱۵

۱۰۱) بھٹی، فقہائے ہند ص:۵/۱۷۵

۱۰۲) ترجمان الحدیث، ماہنامہ، لاہور، فروری و مارچ ۱۹۷۹ء

۱۰۳) اثری، پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات حدیث، ص:۴۱

۱۰۴) ڈاکٹر محمد اسحاق، علم حدیث میں پاک وہند کا حصہ، ص:۱۶۵

۱۰۵) عبدالمصطفیٰ، محمد اشرف، مدارج النبوۃ (مقدمہ)، مکتبہ اسلامیہ لاہور، ص:۶

۱۰۶) ناز، ڈاکٹر ایم ایس، شاہ ولی اللہ اور علم حدیث، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء، ص:۱۱۳

۱۰۷) عراقی، تذکرۃ النبلاء، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۴۵

۱۰۸) ناز، ڈاکٹر ایم ایس، شاہ ولی اللہ اور علم حدیث، ص:۱۱۳

۱۰۹) عراقی، عبدالرشید، تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء، ص:۳۲۴

۱۱۰) ڈاکٹر محمد اسحاق، علم حدیث میں پاک وہند کا حصہ، ص:۲۰۲

۱۱۱) ارشد، عبدالرشید، بیس بڑے مسلمان، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، ص:۱۵۰

۱۱۲) عراقی، تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء، ص:۲۳۳

۱۱۳) ایضاً، ص:۱۳۱

۱۱۴) گھرجاکھی، خالد، سوانح حیات فضل الٰہی، جمعیت المجاہدین، گوجرانوالہ، ۱۹۳۲ء، ص:۶۱

۱۱۵) چشتی، عبدالحلیم، حیات وحید الزمان، نور محمد کارخانہ تجارت آرام باغ، کراچی، ص:۱۵

۱۱۶) ارشد، بیس بڑے مسلمان، ص:۳۷۰

۱۱۷) میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ، ۱۹۴۹ء، ص:۲۶

۱۱۸) عبدالحیی، نزھۃ الخواطر، ص:۸/۲۴۲

۱۱۹) حافظ محمد گوندلوی، درس صحیح بخاری، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، مرتب منیر احمد سلفی، ص:۹

۱۲۰) انصاری، عبدالعظیم، تذکرۃ علمائے بھوجیان، ناشر عمر فاروق بھوجیانی، قصور ۱۹۸۴ء، ص:۲۷

۱۲۱) ظفر، عبدالروف، علوم الحدیث، کتاب سرائے، لاہور ۲۰۱۲ء ص:۶۷۸-۶۸۹

۱۲۲) قادری، حقانی، ڈاکٹر، دینی مدارس نصاب ونظام تعلیم، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص:۳۴۱

۱۲۳) سلیبس شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۵ء

۱۲۴) نوشہروی، امام خاں، ابو یحیٰ، تراجم علمائے حدیث ہند، مرکزی جمعیت اہلحدیث، لائل پور، ص:۳۳

****

اُمّیّتِ رَسُول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور مستشرقین

Orientalistic view of Prophet's illiteracy

عبدالوہاب جان الازہری*

ABSTRACT

Orientalists have always denied the acceptance of the divinity and authenticity of Qur'an. For this purpose, they have presented multifarious objections to prove the Qur'an as a discourse of Muhammad ﷺ which he learnt from the Christian monks and derived it from the judeo-Christian sources.

They specially mention that Muhammad ﷺ was not an illiterate person he was rather a pupil of the monks. In this way, their aim is to prove false the claim of the miraculous (I'jaz) style of the Qur'an. We have proved in this study that according to Quran, Tafaseer and Hadiths of Prophet ﷺ, history and logic, that Muhammad ﷺ since his birth until his death,was illetrate ,did not know how to read or write.

In this paper, an effort has been made to examine the Western arguments and deduce the actual position in this matter. The basic and fundamental sources have been used to precede the discussion.

Keywords: Orientalists, authenticity of Qur'an, judeo-Christian, Prophet's illiteracy (Ummiyyat).

* لیکچرار شعبہ عقیدہ وفلسفہ اسلامی، کلیہ دراسات اسلامیہ (اصول الدین)، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انہوں نے ساری ساری عمریں علومِ اسلامیہ کی تحقیق و تدریس میں صرف کر دیں، اور بڑی جانکاہ محنت کر کے مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی عظمت رفتہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کی نادر ونایاب کتابوں کا پتہ چلایا، بے حد مشقت اور بڑے اخراجات کے تحمل کے بعد ان تک رسائی حاصل کی اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ انہیں شائع کیا، ان پر حواشی لکھے، ان کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شائع کیے، اسلامی موضوعات پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں اور اسلامی علوم وفنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع لٹریچر فراہم کیا۔ ان کی ان خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کی محنت و جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہو گی۔ لیکن اسی کے ساتھ جہاں اسلام کے متعلق ان کے افکار، خیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے۔ خالص اسلامی نقطہ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے۔ اس لیے کہ اسلامی مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات میں انہوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے، یا تو وہ مشرقی روایات، مشرقی مذاق اور خصوصاً اسلامی ذوق و نظر سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے علومِ اسلامیہ کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں، یا عمداً وہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں۔

بہر حال جو بھی صورت حال ہو ان کی یہ غلطیاں علم و فن کی خدمت اور تحقیق کے پردے میں ہوتی ہیں، یہ زمانہ تحقیق کا ہے، اس لیے ان سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلتی ہیں بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فلسفہ، عجمی دہریت اور ہندووانہ خرافات، کسی سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہنچا ہے۔ جس کے مظاہر آئے دن، آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں۔ اس لیے دین اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اندھا اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔

اس سلسلے میں مستشرقین نے جو الزامات قرآن مجید (کتاب اللہ) پر لگائے کہ یہ محمد ﷺ کی تالیف کردہ کتاب ہے، اس پر ان کی مختلف تحریریں اور مضحکہ خیز دلائل سامنے آئے جن میں سے ایک نبی کریم ﷺ کی اُمّیّت کا انکار ہے۔

زیرِ نظر بحث میں اس موضوع پر مستشرقین کے الزامات کا جائزہ لے کر رسولِ اسلام ﷺ کے اُمّی ہونے کا عالمانہ دفاع اور اُن کے زہر آلود دلائل کے رد کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ مزید بر آں مستشرقین نے قرآن کریم کے حوالے سے جو مطالعہ اور تحقیق کی اس کے بارے میں یہاں مختصراً تحریر کیا گیا۔ اس سلسلے میں مستشرقین نے قرآن کریم کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا۔ سب سے پہلا کام انہوں نے قرآن کریم کے معنوں کا ترجمہ کیا۔

بارہویں صدی عیسوی میں Robert of Ketton (1160ء- 1110ء) کی طرف سے کیے گئے لاطینی زبان کے ترجمے "ایک جھوٹے پیغمبر محمد کے قوانین" (Lex Mahumet Pseudoprophete)

میں جو کسی بھی یورپی زبان میں قرآن کریم کا پہلا ترجمہ تصور کیا جاتا ہے۔[1] اس میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ تنقیدی تشریح بھی کی جس کا مقصد مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنا اور عیسائیت کو قبول کرنے کی طرف راغب کرنا تھا۔ اس کے بعد لوڈویک مراسی، پھر جارج سیل اور بعد ازاں جرمن زبان میں Gustav Flugel (1802-1870) کا ہے۔

ان تمام مستشرقین کے قرآن کریم کے بارے میں جو من گھڑت دعوے سامنے آئے ہیں ان میں پہلا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا مصدر یہودیت اور عیسائیت ہے۔ اور وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم میں پرانے زمانے کے لوگوں کے قصص ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے تورات اور انجیل سے اخذ کیے ہیں۔

جیسا کہ مستشرق الفریڈ گیوم "Alfred Juillaume" (۱۸۸۸ء-۱۹۶۶ء) اور منٹگمری واٹ Watt وغیرہ کے تمام مطالعے کا محور قرآن کی بشریت کا دعویٰ اور یہ کہ محمد ﷺ نے قرآن یہودیت اور نصرانیت سے اخذ کیا ہے، پر تھا۔ اس سلسلے میں الفریڈ گیوم کی دو کتابیں "الاسلام" ۱۹۵۴ء میں Penguim سے اور "حیات محمد" ۱۹۵۵ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی۔ اور واٹ کی "محمد ﷺ مکہ میں" "یا محمد ﷺ کا مکہ"[2] وغیرہ۔

اسی طرح ایک امریکی ادیب مستشرق ایچ۔ اے ولفسن (۱۸۸۷-۱۹۷۴ء) نے (The Philosophy of the Kalam) نامی کتاب میں بھی خرافات کی انتہا کر دی۔ جو Harward University Press سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

مسٹر ولفسن جب ترجمہ کرتے ہیں تو وہ معنی اور مراد سے ہٹ کر کرتے ہیں، حتیٰ کہ ایک ہی آیت کے اندر موجود قرآئن، آیتوں کے سیاق وسباق کی کوئی پروانہیں کرتے اور ترجمہ ٹھونس دیتے ہیں۔ مثلاً "یحیی ویمیت" کا ترجمہ کرتے ہیں "He, Maketh and Killeth" یعنی "یمیت" کا ترجمہ "قتل" سے کرتے ہیں۔[۳] اس کا صحیح ترجمہ انگریزی میں اس طرح بنتا ہے۔

(Allah Makes and causes die)

اسی طرح ایک یہودی مستشرق ابرھام جیگر "Geiger Abraham" بھی قرآن کا مصدر تورات بتاتے ہیں۔[۴]

جب ہم ایڈورڈ پالمر Palmer Edward Henery (1840-1882)، انگریز مستشرق اور جاسوس کے ترجمہ کو دیکھتے ہیں تو وہ لفظی ترجمہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے اسلاف کی طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن کریم حضرت محمد ﷺ کی تالیف کردہ ہے۔ اس لیے قرآن کی زبان میں کھردرا پن، سختی اور کجی بہت ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ فصیح اللسان نہیں تھے۔ مذکورہ شخص اپنے ترجمہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ میں نے قرآن کا لفظی ترجمہ کیا ہے اور جہاں جہاں زبان کی سختی اور تعبیر میں کوئی عدم وقار ہو تو میں نے انگریزی میں بھی اسی طرح ترجمہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

مسٹر پالمر چونکہ دشمنِ اسلام ہے اس لیے وہ شہد کو بھی زہر کی نظر سے دیکھتا ہے جو کہ تعصب کی انتہا ہے۔ قرآن کریم نہ محمد ﷺ کی تالیف کردہ ہے اور نہ آپ ﷺ کی زبان میں کھردراپن یا سختی ہے بلکہ آپ ﷺ کے عرب وعجم کے دشمن آپ ﷺ کی فصاحت وبلاغت کے قائل ہیں۔ اور یہ اعتراضات خود ہی پالمر صاحب کی کم علمی اور کج فہمی کے لیے کافی ہیں۔[۵]

قرآن کریم کے متعلق ان مستشرقین کے مختلف الانواع اعتراضات آپ کو ملیں گے، اور یہ سب مستشرقین اس پر متفق ہیں کہ یہ کتاب محمد ﷺ کی تالیف کردہ ہے، اس پر ان کے مضحکہ خیز دلائل بھی ملاحظہ فرمائیں۔

لکھتے ہیں:

۱) آپ ﷺ نے مختلف افکار و قصص یہودیت اور نصرانیت سے اخذ کیے ہیں اور پھر آپ ﷺ نے اس کو قرآن کا حصہ بنایا [۶]۔ (جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا)۔

۲) محمد ﷺ ایک عبقری انسان تھے، اس نے بعد میں امت بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ پہلے سے ایک طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت تھا [۷]۔

۳) اس نے شعر و سخن میں کمال حاصل کیا تھا تاکہ قرآن میں ایک ربط و نظم رہے [۸]۔

۴) لفظ وحی سے مراد "نصوص کا الہام الٰہی" نہیں بلکہ اشارے یا Suggestion یا ایک وہمی تکلم Intellectual Locution مراد ہے [۹]۔

۵) قرآن کے اندر بہت سی سائنٹفک غلطیاں ہیں بالخصوص کائنات کے بارے میں، اور بہت سے غیر عربی الفاظ کا قرآن کریم میں موجود ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ محمد ﷺ کی تالیف کردہ کتاب ہے [۱۰]۔

اس سلسلے میں علماء اسلام ان اعتراضات کا تین زاویوں سے ردّ کرتے ہیں۔

(ا) چونکہ کتب سماوی کا مصدر ایک ہی ہے اس لیے اگر ان قصص میں کوئی تشابہ ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(ب) کتب سابقہ میں جو قصص مذکور ہیں وہ تحریفات پر مشتمل ہیں۔ اور ان میں مادی پہلو اور انسانی ہاتھ کا زیادہ عمل دخل ہے۔ اس لیے اس پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ نیز کتب سابقہ میں ان قصص کے بارے میں ایسی فحش تصویر کشی کی گئی ہے کہ ایک کتاب مقدس کو اس کا احاطہ زیبا نہیں ہے۔

(ج) یہ کہ رسول اللہ ﷺ امی تھے، یعنی نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ اور نہ یہ ثابت ہے کہ بعثت سے پہلے کسی یہودی یا عیسائی سے آپ ﷺ کی قرابت اور تعلق ہو۔ تو آپ ﷺ نے کسی طرح یہ قرآن ان سے لیا ہو۔ اور اگر یہ ثابت ہو تو قریش ضرور واویلا مچادیتے اور آپ ﷺ کی تابعداری نہ کرتے۔

چونکہ مستشرقین کا زیادہ زور رسول اللہ ﷺ کی اُمّیّت سے انکار پر ہے[۱۱]۔ کیونکہ اسی امیت سے قرآن کریم کا معجزہ ثابت ہوتا ہے اس لیے ہم بھی اس بحث میں ان ہی کی آراء کا جائزہ لیں گے اور اُن پر رد کریں گے۔

لفظ "اُمّی" قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی ہیں "مَن لَا یقرأ وَلَا یکتُب" جو نہ لکھ سکتا ہو نہ پڑھ سکتا ہو۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَہٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ﴾ [۱۲].

ترجمہ: وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی اُمی ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۫ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ﴾ [۱۳].

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں (وہ) جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگانی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تو اللہ پر اور اس کے رسول، پیغمبر اُمّی پر جو اللہ پر، اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان لاؤ اور ان کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔

یہ دو آیتیں رسول اللہ ﷺ پر منطبق ہوتی ہیں۔ قرآن کریم میں کلمہ "امی" بصورت "امیین" چار جگہوں پر آیا ہے:

۱۔ ﴿ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡہِمۡ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ ۚ وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ﴾ [۱۴].

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے (محمد ﷺ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (اللہ کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

۲۔ ﴿فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡاُمِّيّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ﴾ (۱۵).

ترجمہ: (اے پیغمبر ﷺ!) پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑیں تو فرما دیجیے میں اور میرے پیرو تو اللہ کے فرمانبردار ہو چکے۔ اور اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے کہیے کہ کیا تم بھی (اللہ کے فرمانبردار بنتے اور) اسلام لاتے ہو؟ اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں گے اور اگر منہ پھیریں تو آپ کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ (اپنے) بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

۳۔ ﴿وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴾ (۱۶).

ترجمہ: اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس (مال و دولت کا) ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو (فوراً) واپس دے دے۔ اور کوئی اس طرح کا ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ اُمیوں (غیر یہودیوں) کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہو گا۔ یہ اللہ پر محض جھوٹ بولتے ہیں اور (اس بات کو) جانتے بھی ہیں۔

۴۔ ﴿وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ﴾ (۱۷).

ترجمہ: اور بعض ان میں اَن پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات (یا جھوٹی آرزوؤں) کے سوا (اللہ کی) کتاب سے واقف ہی نہیں۔

پہلی دو آیتوں میں لفظ "امی" رسول اللہ ﷺ کا بطور صفت بیان فرمایا ہے۔ اس پر تمام مفسرین اور لغت کے ماہرین متفق ہیں، اس کی تفصیل مستشرقین کے آراء کے بعد بیان کریں گے لیکن نمونہ کے طور پر لسان العرب میں ابن منظور صاحب لکھتے ہیں:

"محمد ﷺ اللہ کے نبی کی صفت "اُمّی" بیان کرنے کا مقصود یہی ہے کہ امت عربی نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا، تو اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو خود بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اور یہ ان کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا کہ وہ، ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب، جو ان پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اتارا، بغیر کسی تبدیلی اور تغیر کے ان کو سنائیں۔ جبکہ عرب کے خطباء کا یہی طریقہ رہا کہ وہ ہر خطبہ میں حذف واضافت کے ساتھ گردانتے تھے تو حکمت الٰہی کا یہی تقاضا تھا کہ اس کی منزّل کتاب محفوظ رہے اور نبی پر جو نازل ہوا ہو اس میں اس کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ (۱۸).

ترجمہ: اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔ ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔

اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ "اُمّی" وصف ہے اس شخص کا جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہو اور یہ وصف قرآن نے رسول اللہ ﷺ کے لیے استعمال کیا۔ اور "اُمّی" لفظ "اُمّۃ" سے مشتق ہے جس کے معنی "اُمّۃ العرب" ہے کیونکہ عمومی طور پر عرب "اُمّی" تھے۔ اسی وجہ سے عرب کو "امیین" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کہ ان میں خط وکتابت بہت نادر تھی یا بلکہ مفقود تھی، اور اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے ہوتی ہے فرماتے ہیں "بعثت إلى أمة أمية" میں ایک امی امت کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اُمّیّتِ رسول ﷺ میں حکمت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ "امی" پیدا ہوئے اور نبوت ملنے تک "امی" ہی رہے۔ اور یہ جناب رسول اللہ ﷺ کے کمالات اور معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (۱۹).

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے (محمد ﷺ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (اللہ کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی صفت "اُمّی" کہ وہ امیّین پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتے ہیں اور ان کو اس کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں، جیسا کہ امم سابقہ کو انبیاء کرام علیہم السلام کتاب کی تعلیم دیتے تھے اور ان کو حکمت سکھاتے تھے وغیرہ یہ تمام اوصاف رسول اللہ ﷺ کی صفت اُمّیّت کے باوجود بھی بدرجہ اتم موجود تھیں کیونکہ امم سابقہ امیین میں سے نہیں تھیں۔

علامہ فخر الدین رازی صاحب فرماتے ہیں کہ "رسولاً منهم" سے مراد محمد ﷺ ہیں کہ آپ ﷺ ان ہی کے نسب اور حسب سے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (۲۰)

ترجمہ: (لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔

چونکہ کتب سابقہ میں نبی الامّی کی بشارت آئی تھی لہذا اس کا لکھنا پڑھنا نہ جاننا آپ ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتا ہے (۲۱)۔

علامہ سیوطی اور ابن جوزی لکھتے ہیں کہ صفت "اُمّی" تورات اور انجیل میں نبی کریم ﷺ کے لیے استعمال ہوا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہو گا تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے (۲۲)۔

علامہ زرکشی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اُمّی تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تھی تو آپ زبان کو حرکت میں لاتے تھے تو حکم ہوا کہ آپ زبان کو نہ ہلائیں اور ہم جو نازل کر رہے ہیں اس کو غور سے سنیں، اس سب کو محفوظ کرنا، آپ کو یاد کرانا اور آپ کے سینے میں جمع کرنا ہمارا کام ہے [۲۳]۔

مستشرقین کی آراء کا جائزہ

۱۔ سپرنگر Aloys Sprenger (۱۸۱۳ء-۱۸۹۳ء) اپنی کتاب The Life of Muhammad" تین جلدوں کی کتاب میں تین زاویوں سے لفظ "اُمّی" کے بارے میں اپنے مذموم خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

جلد اوّل میں لکھتے ہیں "کہ محمد ﷺ سے پہلے جزیرۃ العرب، اہلِ کتاب اور وثنیین یعنی بت پرستوں میں تقسیم تھا، اہلِ کتاب یہود، نصاریٰ اور صائبین پر مشتمل تھے جن پر آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں، لیکن وثنیین کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔۔۔۔۔۔"

آگے جلد دوم میں تدریجی طور پر لکھتا ہے کہ " اُمّی سے مراد بت پرست ہے"۔ اور پھر جلد سوم میں لکھتا ہے "کہ اُمّی سے مراد وہ انسان ہے جو پڑھ سکتا ہو لیکن لکھ نہ سکتا ہو، استدلال میں قرآن کریم کی آیت پیش کرتا ہے کہ ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾

ترجمہ: اور بعض ان میں اَن پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات (یا جھوٹی آرزوؤں) کے سوا (اللہ کی) کتاب سے واقف ہی نہیں۔

مسٹر سپرنگر آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "ان میں سے امیین ہیں جو لکھنا نہیں جانتے لیکن پڑھ سکتے ہیں، یعنی أَمَانِيَّ سے مراد وہ پڑھنا لیتے ہیں" [۲۴]۔

مسٹر سپرنگر حضرت جعفر صادق سے منسوب ایک شاذ روایت پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کرتے ہیں کہ امی سے مراد وہ شخص ہے جو پڑھ سکتا ہو لیکن لکھ نہ سکتا ہو۔ اور یہ قول اس نے ایک انگریز ایڈورڈ ولیم کی ایک کتاب سے لیا ہے" [۲۵]۔

۲۔ مستشرق وینسنک: A.J. Wensink (1881ء-1939ء)

اسلام دشمن جرمن مستشرق مسٹر وینسنک "Eastern Affairs" نامی رسالہ میں اپنے مقالہ "عقیدہ الاسلام" میں لفظ اُمّی کے بارے میں وہی کہتا ہے جو ان سے پچاس سال پہلے سپرنگر نے کہا تھا نیز اس کے نزدیک لفظ اُمّی سے مراد اہلِ کتاب کے علاوہ اقوام مراد ہیں۔ لیکن وینسنک نے اس میں اضافہ کر کے لکھا ہے کہ لفظ "اُمّی" اُمۃ سے مشتق ہے۔ اور اس کے معنی ہیں بت پرست قوم! نسل اور یہ عبرانی لفظ "جویم" کے مترادف ہے۔

مسٹر وینسنک کی جدّت یہ ہے کہ اس نے عربی لفظ "اُمّۃ" کا عبرانی لفظ "جویم" سے موازنہ کیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ لفظ "جویم" تورات کی "سفر التکوین" میں موجود ہے لیکن لفظ "جویم" کے بارے میں یہودیوں کے اندر بھی اختلاف ہے کوئی اس سے مراد "ایک بادشاہ لیتے ہیں جس نے وادی اردن میں ایک بادشاہ پر چڑھائی کی تھی"، کوئی اس سے مراد "قوم" لیتے ہیں، اس لیے ان کے ہاں اس کا کوئی واضح معنی نہیں پایا جاتا، اور نہ یہ لفظ اسلام کی آمد سے پہلے عرب میں معروف تھا تو یہ وینسنک کا ایک مفروضہ ہے [۲۶]۔

۳۔ جوزف ہروٹیز (osef Horovitz) (1874ء-1931ء)

اسلام دشمن یہودی عالم جرمن مستشرق ہروٹیز نے اس سلسلے میں اپنے دو مقالوں "قرآن کریم میں یہودی ناموں اور اس کا اشتقاق" اور "قرآنی مباحث[۲۷]" میں "اُمّی" کا ترجمہ اپنی عبرانی تعبیر کے مطابق کر کے لکھتا ہے کہ "اُمۃ ھاعولام" یعنی اسرائیلی قوم کے مقابل اقوام عالم"، آگے لکھتا ہے کہ "اُمّی" کی صفت سیدنا محمد ﷺ کے لیے مناسب نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد "کافر" یا "بت پرست" ہے۔ تو اس صفت سے موصوف ہونا ایک قسم کی اہانت ہے [۲۸]۔

۴۔ فرانٹس بوہل Frants Buhl (1850-1932ء)

مسٹر بوہل لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ فن قراءت و کتابت سے واقف تھے، لیکن یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں کے فہم سے قاصر تھے۔۔۔ یا یہ کہ کسی نے ان کو اس کی تعلیم دی ہو جب وہ کسی عبارت یا قصے کو تورات سے نقل کرتے تھے [۲۹]۔

۵۔ نیلنو (Carlo Alfanso Nallino) (1872-1938)

یہ ایک ایطالی مستشرق ہے، لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ صرف عربوں کے لیے آئے تھے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام قومِ اسرائیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور عیسیٰ علیہ السلام فلسطینیوں کے لیے آئے تھے۔

ڈاکٹر عبد الرحمن بدوی اس کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی محمد ﷺ ایک عالمگیر پیغمبر تھے، انہوں نے ۶۲۸ء میں اس وقت دنیا کے چار بڑے بادشاہوں کو خط لکھے تھے تو اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت دنیا کی تمام اقوام کے لیے تھی، اگر یہ صرف عربوں کے لیے آئے ہوتے تو پھر انہوں نے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کیوں دی؟

اور ساتھ ہی قرآن کریم ہی کے اندر یہ وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام عالم کے لیے مبعوث ہیں۔ کیونکہ لفظ "اُمّی" کی نسبت لفظ "امم" کی طرف ہے جو کہ جمع ہے امت کا یعنی لفظ "اُمّی" مشتق ہے "امم" سے جس کے مفرد کے معنی ہیں "عالمی" پس "النبی الامی" سے مراد "النبی العالمی" ہے۔ اور قرآن کریم میں جو لفظ "الامیین" جمع کے صیغہ کے ساتھ چار مرتبہ آیا ہے یعنی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۷۸ میں، سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۲۰ اور ۷۵ میں اور سورۃ الجمعہ کی آیت نمبر ۲ میں، اس کے معنی ہیں مختلف امم یا تمام اقوام عالم پس لفظ "اُمّی" نبی کریم محمد ﷺ پر منطبق ہوتا ہے جس کے معنی ہیں "عالمی" یعنی تمام اقوام عالم کے لیے مبعوث، اور لفظ "الامیین" کے معنی ہیں "تمام اقوام عالم" (۳۰)۔

اور ڈاکٹر بدوی صاحب آیت کریمہ ﴿وَمِنْهُمْ اُمِيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "امیون" کتب مقدسہ سے واقف نہیں تھے۔ اور اس بات پر ان کو ملامت نہیں کیا جاسکتا اگر ایسا ہو تو پھر عیسائی بھی بدھ مت کی کتابوں کو نہیں جانتے تھے۔۔۔ (۳۱)۔

۶۔ مستشرق ہوارٹ کا یہ الزام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے شام کے سفر میں بصریٰ کے پادری بحیرا الناصری سے شام کے قریب ملاقات کی تھی جنہوں نے آپ کو مذاہب کے بارے میں بتایا تھا۔ نیز یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو وہ سورتیں سکھایا کرتے تھے جو قرآن کریم میں وارد ہوئیں (۳۲)۔

افتراء پردازی کی انتہا ہے اور خلافِ عقل الزام بھی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر میں جب روانہ ہوئے تھے تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۱۲ سال تھی۔ اور سفر میں

مذکورہ پادری سے جو ملاقات ہوئی تھی وہ اس پادری سے آپ ﷺ کی زندگی کی پہلی اور آخری ملاقات تھی ۔ یہ ملاقات ۵۸۲ء میں ہوئی تھی اور قرآن کا نزول ۶۱۰ء میں شروع ہوا تھا، یعنی رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے ۴۰ سال بعد، اس ملاقات کے ۲۸ سال کے بعد قرآنی سورتوں کا نزول شروع ہوا۔ سیرت کی کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ۲۸ سال کے اس عرصے میں بلکہ ۶۲۱ء تک ہجرت مدینہ سے پہلے مکہ میں رہے، اس عرصے میں پادری بحیرا سے نہ مکہ میں آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی نہ مدینہ میں کہ وہ آپ ﷺ کو سورتیں سکھاتے۔ نہ اس وقت اتنی تیز ٹیکنالوجی تھی کہ سینکڑوں میل دور پادری ان کو بذریعہ ٹیلکس یا انٹرنیٹ سکھاتے (یا للعجب)!

مستشرقین جس افترا پردازی کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ اس کتاب یا ماخذ جس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہے ہیں پیش نہیں کر سکتے اور نہ کر سکیں گے۔ ان شاء اللہ، کیونکہ یہ ان کی اپنی گھڑی ہوئی چالیں ہیں۔

مستشرقین کی ایک جماعت جن میں کلیمان ہوار، یہودی مستشرق مارگولیتھ اور جاسٹان فیٹ مصنف کتاب "Glory of Islam" وغیرہ کا الزام ہے کہ قرآن کریم اللہ کا نازل کردہ کلام نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی تصنیف ہے [۳۳]۔

یہ ایک ایسا جھوٹا الزام ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں، ہر شخص کو یہ معلوم ہے کہ آپ ﷺ کا بنیادی پیشہ بکریاں چرانا اور تجارت کرنا تھا، زندگی کے کسی بھی مرحلے میں آپ ﷺ نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اُمّی تھے، ۵۳ سال تک مکہ مکرمہ میں رہے کسی سے کوئی پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔

مکہ میں ۸۶ سورتیں اور مدینہ منورہ میں ۲۸ سورتیں نازل ہوئیں کل ملا کر ۱۱۴ سورتیں ہو گئیں۔ تو پھر کیسے ایک انسان جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا وہ ۱۱۴ سورتوں کی تصنیف کر سکتا ہے جو ۶۶۶۶ آیتیں، ۷۷۸۴۵ الفاظ اور ۳۳۰۷۳۳ حروف پر مشتمل ہیں، ادبی فصاحت و بلاغت کا ایک معجزہ اور حکمت کی باتوں پر مبنی کتاب کی ایک امی شخص خود تصنیف کرے، بھلا یہ سب کیسے ممکن ہے؟!!!

درحقیقت مستشرقین رسول اللہ ﷺ کی اندھی دشمنی میں ایسی چیزوں کا تصور پیش کرتے ہیں جن کا عقل تصور بھی نہیں کر سکتی۔

۷۔ سٹوبرٹ: لکھتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ "اُمّی" نہیں تھے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ میں بعض واقعات اس بات کی دلالت کرتے ہیں جیسا کہ صلح حدیبیہ کے معاہدے کو رسول اللہ ﷺ نے خود تحریر فرمایا (۳۴)۔ اس مستشرق کے تاریخی مطالعے کی درستگی عنقریب کریں گے۔

۸۔ مونٹگمری واٹ (Montgomery Watt) مونٹگمری واٹ ہمیشہ اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرتا رہا ہے لیکن اس کی کتاب "Mohammad at Mecca" تعصب اور رسول پاک ﷺ کی شان عظیم میں اور اس پر منزّل کتاب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ اور خصوصاً اُمیت رسول ﷺ کے انکار اور تشکیک میں اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔

مسٹر واٹ "ما أنا بقارئ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"محمد ﷺ کا قول "ما أقرأ" جو فرشتہ کے قول " اقرأ" کے جواب میں کہا تھا کی تفسیر "میں قرات یا تلاوت نہیں کر سکتا ہوں" ہونا چاہیے۔ کیونکہ ابن ہشام کی روایت بھی "ما أقرأ" اور "ماذا أقرأ" اور "ماذا أتلو" یعنی میں کس چیز کی تلاوت کروں، جو کہ "ما أقرأ" کا ایک فطرتی معنی ہے۔۔۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل واضح ہے کہ متاخرین اور تقلیدی مفسرین مذکورہ معنی بیان کرنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ یہ کلمات اور معانی ان کے اس عقیدہ کی بنیاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اور یہ بات قرآنی معجزہ کا اہم عنصر ہے" (۳۵)۔

واٹ صاحب آگے حدیث کے راویوں پر الزام لگاتے ہیں ان کے بقول "متاخرین راوی ایسی من گھڑت روایتیں پیش کرتے ہیں جس سے امیت محمدی ثابت ہوتی ہے" حالانکہ امیت محمدی ان متاخرین راویوں کی گھڑی ہوئی باتیں ہر گز نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ واٹ اور دوسرے مستشرقین کا الزام ہے کہ رسول اللہ ﷺ بالکل امی نہ تھے کیونکہ وہ کامیاب تاجر تھے اور تجارت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ حساب کتاب برابر رکھنے کے لیے لکھنا پڑھنا جانتا ہو" اور اس وقت مکہ کے اکثر لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے (۳۶)۔

اس اندھے متعصب کا علمی محاسبہ آخری مستشرق باربہ کے بعد کریں گے۔

۹۔ فرانسیسی مستشرق باریہ لکھتے ہیں:

﴿وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴾ (۳۷)

ترجمہ: اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس (مال و دولت کا) ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو (فوراً) واپس دے دے۔ اور کوئی اس طرح کا ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ اُمیوں (غیر یہودیوں) کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ اللہ پر محض جھوٹ بولتے ہیں اور (اس بات کو) جانتے بھی ہیں۔

اس آیت میں امیین سے مراد وہ لوگ نہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے بلکہ اہل کتاب نے اس کو بت پرستوں کے لیے استعمال کیا تھا۔ اور محمد ﷺ کے لیے لفظ "اُمّی" کے جو معنی مراد لیا جاتا ہے اس کا صحیح تعین نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ بعض لغوی عوامل لفظ "اُمّی" کا معنی "جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو" کی تحدید مشکل ہے۔

عربی زبان میں لفظ "اُمّی" اور عبرانی میں "اماع" اور آرامی زبان میں "امیتا" اُس امت پر دلالت نہیں کرتا جو جہالت کی حالت میں ہو۔ بعض لوگوں نے لفظ امی کا اطلاق محمد ﷺ پر کیا ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ "امی" کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ آیت ﴿وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ﴾ میں "امیّین" سے مراد وہ نہیں جو لکھنے پڑھنے سے عاری ہوں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ منزل آسمانی کتابوں کی معرفت سے نابلد ہوں (۳۸)۔

بظاہر علمی دعویٰ لیکن انتہائی جہالت پر مبنی، اور اندھے تعصب سے بھرپور الزام اور بغیر سند کے ریمارکس؟!!" ﴿وَهُوَ فِى الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ﴾ (۳۹)

لفظ "اُمّی" کی لغوی تحقیق اور مستشرقین کی آراء کا علمی محاسبہ

مستشرقین کی آراء کا جائزہ لینے اور ان کے اعتراضات اور شبہات کے جوابات سے پہلے لفظ "امی" کی تحقیق بے حد ضروری ہے۔

لفظ "اُمّی" کا لغوی مفہوم:

ابن منظور کہتے ہیں کہ لفظ "اُمّی" اس کو منسوب کرتے ہیں جو کوئی اپنی ماں کی خصلت پر ہو یعنی جو نہ لکھ سکتا ہو نہ پڑھ سکتا ہو وہ "اُمّی" کہلاتا ہے کیونکہ لکھنا ایک کسبی چیز ہے جو تعلیم سے حاصل کی جاتی ہے یا اس کو جو "اُمّ" سے منسوب کیا جاتا ہے گویا کہ ماں نے جس حالت میں اس کو جنا ہے، وہ اسی حالت پر ہے یعنی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا (۴۰)۔

شہاب الدین الزہری لکھتے ہیں کہ لفظ "اُمّی" اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ کیونکہ وہ ابھی بھی اسی حالت میں ہے جس حالت میں اس کو ماں نے جنا تھا، اور کتابت کسبی چیز ہے جو تعلیم سے حاصل کی جاتی ہے اس طرح قراءت یعنی پڑھنا، کسی کتاب کا ہی ہوتا ہے (۴۱)

راغب اصفہانی صاحب فرماتے ہیں۔

" اُمّی وہ ہوتا ہے جو نہ لکھ سکتا ہو نہ کتاب سے پڑھ سکتا ہو " (۴۲)۔

ابن قتیبہ کے نزدیک " لفظ اُمّی اس کو کہتے ہیں جو نہ لکھ سکتا ہو، کیونکہ یہ امت عرب کو منسوب ہے یعنی عرب بطور جماعت جو لکھنا نہیں جانتے تھے " (۴۳)۔

الشیخ محمد عبدالعظیم الزرقانی فرماتے ہیں کہ "اس سے مراد یہ نہیں کہ تمام امت عرب لکھنے پڑھنے سے قاصر تھی، بلکہ ان میں سے کچھ لوگوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور قریش کے اندر کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اسلام کی آمد سے تھوڑا عرصہ پہلے لکھنا سیکھ لیا تھا یہ اللہ کی طرف سے نبی ﷺ کی بعثت کے کچھ آثار اور اشارے دیتے تھے اور دینِ اسلام اور آمد رسول ﷺ کی ایک تمہید کی مانند تھی کہ جب وحی نازل ہو جائے تو اس کی کتابت کا بھی بندوبست ہو اور اس منزل کتاب کی حفاظت ہو۔ پس حکم امیت اس امت پر بطور کثرت اور غلبہ کے ہے، تمام امت پر نہیں " (۴۴)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ "اُمّی" لغت کے آئمہ کے نزدیک اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، اور جو مستشرقین کے نزدیک اس کے معنی ہیں غیر کتابی یا غیر یہودی یا بت پرست وغیرہ، ان کی اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

مشہور مفسرین کے نزدیک لفظ اُمّی کے معانی:

مفسرین بھی اہل لغت کے معانی پر متفق ہیں، امام طبری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، کہ امیین سے مراد وہ لوگ ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ دلیل میں نبی کریم ﷺ کی حدیث پیش کرتے ہیں۔

((إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ، لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ، الشَّهْرُ هَكَذَا وَهَكَذَا وَهَكَذَا» وَعَقَدَ الْإِبْهَامَ فِي الثَّالِثَةِ «وَالشَّهْرُ هَكَذَا، وَهَكَذَا، وَهَكَذَا» يَعْنِي تَمَامَ ثَلَاثِينَ))
(۴۵)

ترجمہ: ہم امی امت (کے لوگ) ہیں نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ ہم حساب کرتے ہیں مہینہ اس طرح ہوتا ہے اور اس طرح اور اس طرح اور تیسری مرتبہ میں انگوٹھے کو بند فرمالیا اور مہینہ اس طرح اور اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے یعنی مکمل تیس (دنوں) کا۔

جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ "اُمّی" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لفظ "اُمّی"، اُمّی امت کی طرف منسوب ہے جو ان کی ماؤں کی طرح پیدا ہوئے، وہ بھی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھتی تھیں اور لکھی ہوئی چیزوں کو بھی نہیں پڑھ سکتی تھیں (۴۶)۔

صاحب تحفۃ الاحوذی فرماتے ہیں کہ حدیث " أنا أمة أمية۔۔۔" سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ماؤں سے ولادت کی سی حالت اور پرانی خصلت پر ہیں کہ انہوں نے لکھنا اور حساب کرنا نہیں سیکھا (۴۷)۔

امام قرطبی آیت کریمہ ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ (۴۸) کی تفسیر میں لکھتے ہیں "کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بیان کی وضاحت فرمائی ہے کہ محمد ﷺ قرآن کریم سے پہلے "اُمّی" ہونے کی وجہ سے پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اگر وہ لکھنا پڑھنا جانتے تو جن کے دلوں میں بیماریاں ہیں وہ شک میں پڑ جاتے۔ مزید برآں "من" مجرور جب نکرہ پر لگ جاتا ہے اور وہ نافیہ ہو تو وہ مطلق زمانے پر دلالت کرتا ہے یعنی نبی کریم ﷺ نبوت سے پہلے اور نہ بعد میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ آپ ﷺ نے کسی سے سیکھا بلکہ وفات تک "اُمّی" ہی رہے، نہ لکھ سکتے تھے نہ پڑھ سکتے تھے۔ اور نحاس کہتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے کیونکہ آپ ﷺ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی اہلِ کتاب سے ان کا اختلاط رہا کہ ان سے سابقہ امتوں اور انبیاء کرام کے بارے میں معلومات لے لیں پس شک وشبہ زائل ہوا" (۴۹)۔

امام زمخشری آیت ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں "کہ ان پر آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں باوجود یکہ وہ خود بھی ان جیسے "اُمّی" ہیں نہ کبھی اس سے قراءت وارد ہے اور نہ اس کا سیکھنا، اور "اُمّی" کی قراءت یہ ایک واضح معجزہ ہے" (۵۰)۔

تفسیر جلالین میں امام جلال الدین المحلی مذکورہ آیت کی تفسیر میں الامیین سے مراد "عرب" لیتے ہیں اور ان کے نزدیک "اُمّی" وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ پڑھ سکتا ہو (۵۱)۔

اسی طرح ابو السعود بھی اپنی تفسیر میں مذکورہ آیت "امیین" سے جلالین کی طرح "عرب" لوگ مراد لیتے ہیں کیونکہ ان میں اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کی کتابت سیکھنے کے کوئی ثبوت نہیں۔ تو باوجود اس کے "اُمّی" ہونے کے ان پر آیتوں کی تلاوت بھی کرتے ہیں (۵۲)۔

الشیخ محمد الصابونی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ " **أی وما کنت یا محمد تعرف القراءة ولا الکتابة قبل نزول هذا القرآن لأنك أمیّ**" (۵۳)۔

ترجمہ: اے محمد ﷺ آپ اس قرآن کے نزول سے پہلے نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا کیونکہ آپ "اُمّی" ہیں۔

امید ہے کہ مذکورہ بالا گزارشات سے مستشرقین کے بعض اعتراضات کا جواب اجمالی طور پر واضح ہو چکا ہو گا اور مزید وضاحت کے لیے ایک مستشرق سٹوبرٹ اور واٹ کے بعض استدلالات کا علمی محاسبہ زیرِ نظر عبارات میں ملاحظہ فرمائیے۔

مسٹر سٹوبرٹ اور دیگر مستشرقین یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ صلح حدیبیہ میں جب مشرکین مکہ کے ساتھ معاہدہ لکھا جارہا تھا تو اس شق پر کہ یہ معاہدہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان ہو رہا ہے، قریش نے اعتراض کیا کہ یہ ہمیں منظور نہیں ہے اختلاف تو لفظ "محمد رسول اللہ ﷺ" پر ہے اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ ﷺ کو کسی چیز سے نہ روکتے، آپ ﷺ تو محمد بن

عبد اللہ ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں محمد بن عبد اللہ ہوں، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیں، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں اس لفظ کو نہیں مٹاؤں گا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے دستاویز لے لی اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے مٹا کر لکھا" (۵۴)۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بلاواسطہ لکھائی کی۔ جب لکھائی ثابت ہوئی تو قراءت کرنا اور پڑھنا بھی ثابت ہوا کیونکہ قراءت اور کتابت لازم وملزوم ہیں۔ پس اس سے آپ ﷺ کی امیت ثابت نہیں ہوتی۔

اس کا انکاری جواب یہ ہے کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بلاواسطہ لکھائی کی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھنے کا حکم ہوا تو کتابت آپ ﷺ کو منسوب ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایت چونکہ مختلف طریقوں اور راویوں سے مختلف الفاظ میں وارد ہے اس لیے اس میں کچھ ابہام کا احتمال ہے۔ لیکن محور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امر کتابت ہی ہے۔ ان روایات کا جائزہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

- صحیح بخاری میں یہ روایت حضرت انس بن مالک سے مروی ہے "**فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَاللَّهِ إِنِّي لَرَسُولُ اللَّهِ، وَإِنْ كَذَّبْتُمُونِي، اكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ** " (۵۵)
ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم لوگ مجھے جھٹلا رہے ہو، (اے علی) لکھ دو "محمد بن عبد اللہ"۔
- اس طرح صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں " **وَلَكِنِ اكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ**" (۵۶) لکھ دو کہ یہ "محمد بن عبد اللہ" کی طرف سے ہے۔
- صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہیں: " **ثُمَّ قَالَ لِعَلِيٍّ: «امْحُ رَسُولُ اللَّهِ»، قَالَ: لاَ وَاللَّهِ لاَ أَمْحُوكَ أَبَدًا، فَأَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الكِتَابَ، فَكَتَبَ هَذَا مَا قَاضَى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ** (۵۷).

ترجمہ: پھر رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لفظ "رسول اللہ" کو مٹا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں آپ ﷺ (کے نام) کو کبھی بھی نہیں مٹاؤں گا، پھر رسول اللہ نے دستاویز لے لی اور آپ اچھے طریقے سے نہیں لکھ سکتے تھے پھر لکھا کہ "محمد بن عبد اللہ نے یہ فیصلہ کیا۔

- صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔" فَقَالَ لِعَلِيٍّ: «امْحَ رَسُولَ اللهِ»فَقَالَ عَلِيٌّ: وَاللهِ لاَ أَمْحَاهُ أَبَدًا، فقَالَ: «فَأَرِنِيهِ»، فَأَرَاهُ إِيَّاهُ فَمَحَاهُ رسول الله بِيَدِهِ. (۵۸)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا لفظ " رسول اللہ "کو مٹادو، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم میں اس کو کبھی بھی نہیں مٹاؤں گا، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے وہ جگہ دکھاؤ، تو کہتے ہیں کہ آپ نے آپ ﷺ کو وہ جگہ دکھائی تو آپ ﷺ نے اس کو اپنے دستِ مبارک سے مٹادیا۔

- جبکہ ابن حبان نے اپنی کتاب میں بخاری کی درج بالا روایت میں اضافہ کر کے محمد بن عثمان بن العجلی کی ایک روایت نقل کی ہے۔

فَأَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكِتَابَ وَلَيْسَ يُحْسِنُ يَكْتُبُ، فَأَمَرَ فَكَتَبَ مَكَانَ رَسُولِ اللَّهِ مُحَمَّدًا، فَكَتَبَ هَذَا مَا قَاضَى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ (۵۹)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدہ کی کاپی لے لی۔ آپ ﷺ اچھے طریقے سے نہیں لکھ سکتے تھے، آپ ﷺ نے حکم فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "رسول اللہ" کی جگہ محمد ﷺ بن عبد اللہ لکھا پس لکھا کہ یہ محمد بن عبد اللہ کی طرف سے فیصلہ ہے۔

ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لفظ "رسول اللہ" مٹانے کا حکم دیا تھا جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معذرت کی، پھر آپ ﷺ نے اس سے اس جگہ کا پوچھا جہاں رسول اللہ لکھا ہوا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ جگہ دکھائی تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے لفظ "رسول اللہ" کو مٹادیا پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو محمد بن عبد اللہ "لکھنے کا حکم فرمایا۔ اور یہ ان تمام روایتوں کا نچوڑ اور نتیجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ روایت میں جو لفظ "فأرنیہ" ہے مجھے وہ جگہ دکھاؤ" کا وجود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت علیؓ سے لفظ "رسول اللہ" دکھانے کا مطالبہ کر رہے ہیں جو کہ ایک واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ سرے سے پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ نیز یہ کہ وہ مشرک جو رسول اللہ کے ساتھ مذاکرات کر رہا تھا دیکھ لیتا کہ آپ ﷺ نے اس واقعہ میں اپنے دستِ مبارک سے کچھ لکھا ہے تو

ضرور کفارِ قریش میں یہ خبر پھیلا دیتا کہ آپ ﷺ تو لکھنا جانتے ہیں۔ جب اس قسم کی خبر نہیں مل رہی تو پھر یہ لکھنا بھی ثابت نہیں ہوا۔

ہاں! اگر آپ ﷺ سے خود بلاواسطہ اپنا نام مبارک لکھنا ثابت ہو بھی جائے تو کیا اس سے آپ ﷺ کے امیت ختم ہو جاتی ہے، اس کا جواب امام ذھبی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کی اعلیٰ ذہانت اور فطانت اور وحی لکھنے والی جماعت کے ساتھ آپ کی صحبت اور بادشاہوں کو خطوط لکھنے والوں کے ساتھ آپ ﷺ کی وابستگی آپ کو اپنے اور اپنے والد صاحب کے اسم گرامی سیکھنے میں کسی چیز کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

پس آپ ﷺ کا اپنا اور اپنے والد گرامی کے نام کے لکھنے کی معرفت آپ ﷺ کو صفت "اُمّی" سے نہیں نکال دیتی۔ آپ معاشرہ میں اکثر ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں لیکن وہ اپنا نام لکھ سکتے ہوں گے۔

مستشرقین اور ان کے پیروکاروں نے امیتِ رسول کے بارے میں جو شکوک وشبہات پیدا کیے وہ حقیقت کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں۔ انہوں نے واقعہ حدیبیہ کو بطور دلیل پیش کیا ہے لیکن انہوں نے اتنی تکلیف نہیں کی کہ دیگر اسلامی مصادر تک رسائی حاصل کرتے، تو یہ سب ہوا میں تیر پھینکنے اور اندازے لگانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ روایت سے معلوم ہوا کہ اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کے ساتھ قرابت وعداوت میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزارا اور آپ ﷺ کے ہر پل اور خبر سے لمحہ بہ لمحہ واقف ہوتے تھے اور آپ ﷺ کے دن رات کے بارے میں اپنے آپ کو باخبر رکھتے تو سب نے اس بات کا اقرار کیا کہ آپ ﷺ "اُمّی ہیں۔

اس وجہ سے تو قریش نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ (۶۰). آیت میں یہ نہیں کہا "کتبھا" بلکہ الزام یہ تھا کہ "اکتتبھا" یعنی "اس کے لیے کسی اور نے لکھا" ہے۔

مسٹر واٹ کے شبہ کے جواب میں امام ابن تیمیہ کے درج ذیل اقوال کافی وشافی ہیں:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ آیت کریمہ ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں "کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا

حال بیان فرمایا جس کا ہر خاص وعام کو پتہ تھا، اور آپ ﷺ کی قوم کے تمام شاہد اور غائب لوگوں کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ امی ہیں، نہ کسی منزل یا غیر منزل کتاب کا لکھنا جانتے ہیں اور نہ کسی منزل یا غیر منزل کتاب کا پڑھنا جانتے ہیں نہ آپ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور نہ منزل یا غیر منزل کتابوں کو نقل کرتے ہیں" (۶۱)۔

مسٹر واٹ محدثین کو موردِ الزام ٹھہرادیتے ہیں" کہ وہ روایتوں میں گڑبڑ کرتے ہیں جس سے امیت محمدی کا ثبوت نکال دیتے ہیں۔ لیکن واٹ صاحب کے بقول محدثین کی من گھڑت روایت کو چھوڑیں قراءت کی اصلی روایت تو پڑھیں یعنی آیت ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ یہ اصول تحقیق کے منافی ہے کہ ایک ہی روایت پر تکیہ لگا کے حکم صادر فرمایا جائے۔ بلکہ اس موضوع سے متعلق دیگر روایات کو بھی مطالعہ کا ایک حصّہ بنانا چاہیے۔

امام ابن تیمیہ آگے لکھتے ہیں" کہ حضرت محمد ﷺ کرہ ارضی کے علاوہ کسی اور کرہ میں نہیں رہے تھے، اگر وہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے تو مشرکین مکہ ضرور شک وارتیاب میں پڑ جاتے، اور کہتے" کہ اس نے کسی سے پڑھا ہے"، اور اس نے اس قرآن کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی دشمن قوم نے بھی یہ اعتراف کیا کہ آپ ﷺ نے کسی کتاب سے نہ پڑھا ہے اور نہ حفظ کیا کیونکہ آپ ﷺ امی ہیں" (۶۲)۔

مسٹر واٹ کا یہ کہنا کہ یہ "روایتی اسلام" میں ہے کہ آپ ﷺ امی تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، کیونکہ اس امیت محمدی میں قرآن کریم کا اعجاز پنہاں ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مکہ کے اندر لکھنے پڑھنے والے بہت سے لوگ تھے اور محمد ﷺ ایک کامیاب تاجر تھے تو یہ ضروری ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے والے ہوں"

یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ مسٹر واٹ کا مقصد "روایتی اسلام" سے کیا ہے؟ اسلام کے اندر کوئی درجہ بندی تو ہے نہیں، ہاں اگر استشراقی اسلام یا روشن خیال اسلام کی بات ہے تو یہ ضروری ہے کہ روایتی اسلام کی روایات میں شک کریں، کیونکہ روایتی اسلام میں تو قرآن کریم ہی مصدر اوّل ہے اور اس میں مختلف آیتوں سے امیتِ رسول روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

کامیاب تجارت کے لیے لکھنا پڑھنا ضروری نہیں، آپ معاشرے میں دیکھیں کہ اکثر ارب پتی حضرات "Marketing" یا "Finacnce" میں پی ایچ ڈی نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگ ہی ان کا حساب کتاب برابر رکھتے ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے وحی لکھنے کے لیے کاتبین رکھے تھے اور آپؐ کا کاتبین وحی رکھنا بھی امیت رسول اللہ کی ایک واضح دلیل ہے۔

اسی طرح مسٹر واٹ نے "ما أنا بقارئ" کی تفسیر جو "ماذا أقرأ" پیش کی تھی تو اس کا جواب علامہ ابن حجر کا قول مسٹر واٹ جیسے فتنہ پرور مریضوں کا علاج ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "ما" نافیہ ہے، کیونکہ اگر یہ استفھامیہ ہوتا تو باء پر داخل نہ ہوتا۔ اور باء زائدہ ہے جو نفی کی تاکید کے لیے یعنی "ما احسن القراءة" (میں پڑھنا بالکل نہیں جانتا) کے معنی میں ہے۔

مسٹر واٹ تو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، لیکن مستشرقین میں انصاف پسند دو آدمیوں نے آپ ﷺ کی امیت کا اعتراف کیا ہے۔ جن میں سے ایک ول ڈیورانٹ اور دوسرا تھوماس کارئل ہے۔

ول ڈیورانٹ کہتے ہیں کہ کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ محمد ﷺ نے کسی سے لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ اور نہ کوئی اس کے بارے میں علم رکھتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود کتابت کی (۶۳)۔

تھوماس کارئل کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے کبھی بھی کسی استاد سے نہیں پڑھا ہے اور مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ محمد ﷺ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔(۶۴) یہ "وشهد شاهد من أهلها" کے مصداق ہے۔

حاصل بحث:

ظہورِ اسلام کو چودہ صدیاں گزر گئیں اور ابتدائے وحی یعنی ۶۱۰ء میں جب رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی، سے لے کر آج تک شکوک وشبہات کرنے والے اور مستشرقین اسلام، اس کے رسول، اس کے اصول ومبادئ اور اس کی تعلیمات کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شکوک کی یہ لہریں آج تک منقطع نہیں ہوئیں، بلکہ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء میں امریکہ میں پیش آنے والے حادثہ کے بعد اسلام کے خلاف جاری اس لہر میں تیزی آگئی ہے۔

حالانکہ اسلام وہ دین ہے جس نے سابقہ آسمانی مذاہب کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ وہ اسلام قبول کرے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾ (۶۵).

ترجمہ: دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے۔

اسلام نے سابقہ الہامی مذاہب عیسائیت اور یہودیت کو تسلیم کیا ہے، لیکن یہ خود یہودی اور عیسائی مستشرقین کی طرف سے کئے جانے والے حملوں کا شکار ہو رہا ہے۔ اسلام اور اس کے رسول کے خلاف جاری حملوں میں نامناسب اور بدترین حد تک حدت آگئی ہے؟ حملہ ایسے وقت میں کیا جارہا ہے جبکہ ہم بھرپور معلوماتی عہد سے گزر رہے ہیں، اور دنیا کے تمام ممالک کھلے آسمان کے نیچے ایک بستی کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ انٹرنیٹ اور فضائی چینلوں سے بھری ہوئی بستی میں یہ اسلام اور رسول اسلام پر جھوٹے الزامات کا سیلاب لارہے ہیں، لیکن مسلمانوں، اسلامی اور عرب ملکوں کا معاملہ قابل تعجب ہے۔ یورپ اور امریکا میں ۱۲۰ سے زائد استشراقی ادارے ہیں۔ ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کریں، گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیں، اس کے رموز، اس کی تہذیب، اس کے عقیدے، اس کی تاریخ اور اس کی فقہ کو اپنا موضوع بنائیں۔ ہر ہر ادارے کے پاس اس قدر مادی اور معنوی امکانیّات ہیں کہ اسلام سے متعلق سینکڑوں کتابیں جاری کر سکتے ہیں۔ لیکن اُمّتِ اسلامیہ کی سانحہ انگیز حالت یہ ہے کہ عالم اسلام وعالمِ عرب میں ایک بھی ایسا خصوصی تحقیقی ادارہ نہیں پایا جاتا جو حکومتی اداروں کی گرفت اور اس کے چنگل سے آزاد ہو، تاکہ یورپ اور امریکا کے اداروں سے نکلنے والی سینکڑوں تصنیفات کا جواب دے سکے۔ عالمِ اسلامی اور عالمِ عرب سوائے شور وہنگامہ، شکوہ وشکایت کرنے، مذمت کرنے اور مائیکروفون پکڑنے کے اور کچھ نہیں جانتے جیسے کہ مسلمان صرف آواز ہی آواز ہیں تاکہ اسلام اور اس کے رموز کے خلاف مستشرقین جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کے خلاف صرف آواز بلند کریں، لیکن علمی اور فکری سطح پر کوئی حقیقی اور مثبت عمل نہیں پایا جاتا جو مستشرقین کے الزامات اور ان کی افترا پردازیوں کا مؤثر جواب بن کر عالمی سطح پر قابلِ قبول ہو۔

اسلامی ممالک کے ناگفتہ بہ سیاسی حالات کے سائے میں آج ان کے پاس صرف نعرے بازی رہ گئی ہے۔ ان کی کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی وزن نہیں۔ حالانکہ تاریخی مذہبی اور اسلامی پیمانے پر یہ

صورتحال ناقابلِ قبول ہے کہ تمام اسلامی ممالک اسلام اور سول اسلام کی محض زبانی طور پر مدافعت کریں۔ اگر اسلامی ممالک مستشرقین کے الزامات کے خلاف اسلام کا دفاع نہیں کریں گے تو ان اسلامی ممالک کے نزدیک اور کونسا قیمتی سرمایہ اثاثہ ہے جس کا یہ دفاع کریں گے؟ اسلامی ممالک اگر اسلام سے پھر جائیں گے یا اسلام کا دفاع نہیں کریں گے تو اپنی عزت وآبرو کھو بیٹھیں گے۔ اسلام ہی وہ ترکش ہے جو امتِ اسلامیہ کی مدافعت کرنے کا کام کرتا ہے۔ لیکن اللہ رب العزت کسی کا محتاج نہیں اس نے اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے۔ ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (۶۶).

ترجمہ: بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اور لوگ اسلام، قرآن اور صاحب قرآن النبی الامی علی صاحبھا افضل الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں جتنے اور جیسے بھی حملے کریں وہ خود اپنے خنجروں ہی سے ہلاک ہو جائیں گے۔

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۶۷).

ترجمہ: یہ چاہتے ہیں کہ اللہ (کے چراغ) کی روشنی کو منہ سے (پھونک مار کر) بجھادیں حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

اور کیا خوب کہا ہے مدحِ نبوی میں قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے:

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے نقشِ روحِ محمد بنایا گیا
پھر اسی نقش سے روشنی مانگ کر بزمِ کون ومکاں سجایا گیا

وہ محمد بھی، احمد بھی، محمود بھی، حسنِ مطلق کا شاہد بھی مشہود بھی
علم وحکمت میں وہ غیر محدود بھی ظاہراً اُمّیوں میں اٹھایا گیا

حواشی وحوالہ جات

۱) Oxford Dictionary of National Bio-Graphy, Oxford University Press, 2004

۲) Watt: Mohammads Mecca, Edinburg 1988 PP45-46, also see: Harry Austrian wolf son. The Philosophy of te Kalama (USA, Hayward University Press۳),۱۹۷٦ ,P.600. see also Arthur Jeffery the foreign vocabulary of the Quran Breda 1938

۳) Abraham Gelger: Was hat Mohammad aus dem Judentume aufgenommen

۴) Translated as Judaism and Islam Madras 1898

۵) د.عبدالرحمن بدوی، موسوعۃ المستشرقین، دار العلم للملایین، ۱۹۹۳، ص:۱/ ۴۴

۶) Richard Bell: The Origin of Islam and its Christian Environment, London, Abraham Gelger: Judaism and Islam. 1898, A. 1Kash: Judaism in 1926, New york 1954.

۷) W. Muir: Life of Mohammad. ۳rd Edition reprinted 1926, pp.25-26, D.S. Margoliouth: Mohammad and the rise of Islam. London, 1905, PP.64, Montgomery .Watt: Mohammad's Mecca, p 50.

۸) D.S. Morgoliouth: Mohammad and the rise of Islam: p52

۹) Rechard Bell: Mohamamds call, The Moslem World, January 1934, p 13, Watt: Mohammad at Mecca, Oxford,1960, pp.52-58

۱۰) Torry: The Commercial Theological Terms of the Quran, Leiden, Arther , Jeffery the Foreign Vocabulary of the Quran, Broda, 1938

۱۱) Richard Bell the Origin of Islam and Its Christion environment, London,1926

۱۲) سورۃ الأعراف:۱۵۷

۱۳) سورۃ الأعراف:۱۵۸

۱۴) سورۃ الجمعۃ:۲

۱۵) سورۃ آل عمران:۲۰

۱۶) سورۃ آلِ عمران:۷۵

۱۷) سورۃ البقرۃ:۷۸

۱۸) سورۃ العنکبوت:۴۸

۱۹) سورۃ الجمعۃ:۲

۲۰) سورۃ التوبۃ: ۱۲۸

۲۱) فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، دار الفکر بیروت، ، طھران، ص :۱۶/۲۴۱

۲۲) السیوطی ،الدر المنثور لجلال الدین ،دار الفکر بیروت، ص:۵ /۱۴۸:،زاد المسیر، ، ص:۶/ ۱۳۵.

۲۳) الزرکشی،البرہان في علوم القران للزرکشی، دار التراث، ص:۱/۴۸

۲۴) Aloys Sprenger: Das Leben and Die des Mohammad The life and Teaching of Mohammad, Berlin 1861, P 301/1, 224/2, 3/401-402

۲۵) Edward Willium: Arabic English Dictionary, London, 1863 – 1893

۲۶) دفاع عن القرآن ضد منتقدیہ، عبدالرحمن بدوی، الدار العالمیۃ للکتب و النشر، ص: ۱۵

۲۷) Untesuchungan, Berlin Koranischa 1926

۲۸) ایضاً،ص:۱۶.

۲۹) ایضاً

۳۰) ایضا،ص:۱۸،۱۷

۳۱) عبدالرحمن بدوی،دفاع عن القرآن ضد منتقدیہ، ، الدار العالمیۃ للکتب و النشر، ص:۱۸،۱۷

۳۲) ڈاکٹر نبیل لوقا بباوی،دفاع محمد ﷺ ، مرکز اللغات والترجمۃ الاجنبیہ جامعۃ القاہرہ، مصر ص ۲۷

۳۳) ایضاً،ص:۱۶۳

۳۴) Stobert: Non Christian Religion: Islam and its founder pp:53

۳۵) Watt: Mohammad at Mecca

۳۶) Ibd

۳۷) سورۃ آلِ عمران:۷۵

۳۸) Barah, Eneyelopedia&, Islam

۳۹) سورۃ الزخرف:۱۸

۴۰) ابن منظور ،لسان العرب،ص: ۱۲/۳۴

۴۱) الزاہر،لشہاب الدین الزہری الہروی،ص:۱/۱۰۹

۴۲) راغب اصفہانی،المفردات فی غرائب القرآن، دار احیاء التراث العربی،ص:۱ /۲۸

۴۳) غریب الحدیث، ابن قتیبہ،ص: ۱/۸۴

۴۴) مناہل العرفان فی علوم القرآن، محمد عبدالعظم الزرقانی، دار الکتب العلمیہ ط ۲، ص ۲۰۰

۴۵) صحیح مسلم ، ۲/۷۶۱ ، دار إحیاء التراث العربي ، بیروت ، البخاری ۳/۲۷ ، دار طوق النجاۃ ، مصورۃ عن السلطانیۃ ، تفسیر الطبری ص: ۱/۳۷۳

۴۶) فتح القدیر، لکمال الدین الھمام الحنفي ، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۲۰۰۳، ،ص1: /۱۰۴

۴۷) المبارکفوري، محمد عبد الرحمن بن عبد الرحیم ،تحفۃ الاحوذی دارالکتب العلمیہ– بیروت ص:۱۰/۸۹

۴۸) سورۃ العنکبوت:۴۸

۴۹) أبي عبد اللہ القرطبي، الجامع لأحکام القران ، مؤسسۃ الرسالۃ ۲۰۰۶، ص:۳/ ۳۵۲

۵۰) الزمخشری، تفسیر الکشاف دارالکتب العلمیہ ط ۴،ص: ۴/۵۱۷

۵۱) امام جلال الدین المحلی، تفسیر جلالین، طبع: دارالخیر، ص:۵۵۳

۵۲) ابو السعود، ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم، دار الکتب العلمیہ، ص:۶/۲۴۶

۵۳) الشیخ محمد الصابونی، صفوۃ التفاسیر، دارالفکر، ص:۴۲۷

۵۴) Stobert: Non Christian Religion: Islam and its founder pp:53

۵۵) صحیح بخاری، دار السلام، ص:۳ /۱۹۳

۵۶) صحیح بخاری، ص: ۴ /۱۰۳

۵۷) صحیح بخاری، ص: ۳ /۱۸۴

۵۸) صحیح مسلم، ص دار السلام: ۳ /۱۴۱۰

۵۹) صحیح ابن حبان، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ص: ۱۱/۲۲۹

۶۰) سورۃ الفرقان: ۵

۶۱) شیخ الإسلام ابن تیمیہ، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، لشیخ الإسلام، دار العاصمۃ ۱۹۹۹ ،ص:۴/ ۳۱

۶۲) الجواب الصحیح،، ص:۴/ ۲۴

۶۳) قصہ الحضارۃ، ترجمہ بالعربی لمحمد بدران، قاہرہ، ط ،۲ص:۱۳

۶۴) کارئل، الابطال "Heros" ترجمہ بالعربی لمحمد السباعی، الدار القومی القاہرہ، ص:۵

۶۵) سورۃ البقرۃ ۲۵۶

۶۶) سورۃ الحجر:۹

۶۷) سورۃ الصف:۸

خاندانی تعلقات میں نفقہ کا اسلامی تصور

Islamic Vies of Expenses among family Relations

ابوالحسن شبیر احمد *
ڈاکٹر ضیاء الرحمن *

ABSTRACT

In human life, family relations are of basic importance. In the Islamic Law, the proportion of rights and obligations amongst the relatives is in accordance with human nature. The nature of relations amongst family members has been brought into light with Islamic and Natural perspectives. Amongst those rights and obligations, the responsibility for expense is of primary importance, because its clear understanding illustrates the reality of all the family relations which causes the positive effects on the whole society.

In this article, by discussing the expense (rights and obligations) of relatives, the Islamic instructions, basic philosophy, general effects, necessity and its importance has been brought into light. All facts have been presented under two heads of expense (rights) of wife and expense (rights) of the relatives.

But, in the light of Quran and Hadith, it has been agreed by all the Islamic Jurisprudents, upon the necessity/obligation/ compulsion of the right of expense for the relatives just like the right of expense for a wife.

In this article and attempt has been made to clarify that, in a family setup, how much importance has to be given to the rights and duties/obligations of a wife?

Keywords: family relations, rights, obligations, expenses,

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور
** لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں اگر کسی ایک مؤثر ترین تاریخ ساز عامل کی تلاش کی جائے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میں سر فہرست تعلیم آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز سے اسے آراستہ کیا وہ علم تھا اور اپنے تمام انبیاء علیہ السلام کو جو کام سونپا اس میں تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کو مرکزیت حاصل ہے۔

خاندانی تعلقات میں نفقہ کا اسلامی تصور

ہر انسان کی بنیادی ضروریات اور اس کی قلبی تسکین کا حصول اس کے قریب ترین افراد پر منحصر ہے۔ جن کی مدد سے وہ جہانِ رنگ و بو میں قدم رکھتا ہے اور انہیں کی محبت اور شفقت کے ذریعے وہ اپنے بچپن اور بعد کے اکثر مراحل زندگی طے کرتا ہے اور ان کے مالی اور غیر مالی تعاون سے وہ زندگی بھر محظوظ ہوتا ہے۔

شوہر بیوی، ماں باپ، اولاد، بہن بھائی، ددہیال، ننھیال، چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ جیسے تمام الفاظ ہر زبان میں موجود ہیں اور تاریخ کے ہر دور میں ان الفاظ کو ان کے اسی تناظر میں دیکھا گیا ہے اور ان سے وابستہ محبت اور احساس کے ثمرات کو محسوس کیا گیا ہے۔

دنیا بھر کے لوگ اپنی موت وحیات کے اکثر ظاہری اور باطنی تقاضے خاندان کے ذریعے پورے کرتے ہیں۔ وہ خوشی اور غمی کے اوقات میں اپنے خیالات اور دل کا بوجھ انہیں کے سامنے پیش کرکے ذہنی و قلبی سکون پاتے ہیں، انہیں تمام محرومیوں کا مداوا، جسمانی صحت اور ذہنی صلاحیتوں کی حفاظت ابتدائی اور بنیادی اعتبار سے خاندانی ذرائع سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے جو شخص ان رشتوں سے دور ہوا اس کا دل ان کے لیے ہمیشہ بے چین رہا اور اس کی روح بے تاب رہی۔

قرآن مجید میں تخلیق انسانی کی مناسبت سے فرشتوں کے دو سوالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلا سوال یہ کہ کیا انسان کی صورت میں ایسی مخلوق پیدا کی جارہی ہے جو زمین پر فساد برپا کرے گی؟ اور دوسرا سوال یہ کہ ہم تسبیح و تحمید اور تقدیس تو کر رہے تھے پھر انسان کی تخلیق کا کیا مقصد ہے؟[1]۔

مذکورہ سوالات کے جواب میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وہ صراحت کے ساتھ قرآن میں موجود ہے کہ تخلیق انسانی کا مقصد اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور اس کا علم فرشتوں کو نہیں ہے لیکن قرآن مجید میں ان سوالوں کو ذکر کر کے دو باتیں واضح کی گئیں:

۱۔ یہ کہ انسانوں کی شیطانی خواہشات کی بنا پر ان کے مابین فساد اور عداوت یقینی امر ہے۔

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں جیسی پاکیزہ مخلوق کی زبان سے یہ ظاہر کر دیا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد محض اللہ کی رسمی عبادت نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اللہ کی غلامی، عبدیت اور فرمانبرداری کی بنیاد پر بنی آدم کے باہمی تعلقات کو درست رکھنا ہے۔

انسانوں کے باہمی تعلقات دو طرح سے وجود پذیر ہوتے ہیں:

۱۔ خاندان کی صورت میں۔

۲۔ معاشرے کی صورت میں۔

خاندانی تعلقات مرد و عورت کے مابین رشتۂ ازدواج سے وجود میں آتے ہیں اور پھر وہ رشتہ بچوں کی پیدائش کے بعد والدین کی شکل اختیار کر کے خاندانی نظام کا سرِ عنوان بن جاتا ہے گویا کنبہ اور خاندان کی بنیاد رشتۂ ازدواج اور رشتۂ ولادت پر ہے۔ ان میں سے رشتۂ ولادت خالص ایک غیر اختیاری اور فطری معاہدہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جس میں والدین کی بے مثال خدمات سر فہرست ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں اولاد بہن، بھائی، چچا پھوپھی اور باقی رشتہ داروں کی ذمہ داریاں عمل میں آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے پورا خاندان اطمینان و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے اور خاندان کی تمام اطراف سے مخلصانہ تعلقات، حقوق و فرائض اور خدمات کے کئی سلسلے چل نکلتے ہیں اور نسل در نسل چلتے رہتے ہیں۔

اس کے برعکس معاشرتی روابط کا تعلق گھر سے باہر کی زندگی کے ساتھ ہے۔ جس کا دارومدار زراعت، صنعت، تجارت اور ملازمت کے سیاسی و معاشی اداروں اور ان کے اجتماعی نظم پر ہے۔ جہاں پر اشیاء اور خدمات کا تبادلہ اختیاری معاہدات اور باہمی معاوضات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس بحث سے معاشرتی اور خاندانی تعلقات کے درمیان کئی فرق ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ **پہلا فرق** یہ کہ خاندانی تعلق کی پشت پر بالعموم موروثی فطری اور غیر ارادی رشتہ موجود ہے جس کے لوازمات کا تعین بچے کی پیدائش سے اپنے آپ ہو جاتا ہے اور فطری تقاضے کے تحت دنیا کا ہر

قانون اور خاص طور اسلامی قانون اسے تسلیم کرتا ہے۔ جبکہ غیر خاندانی تعلقات عموماً ایسے معاہدات کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں جنہیں انفرادی یا اجتماعی سطح پر اپنے اختیار سے وجود میں لایا جاتا ہے اور ان کی شرائط اور حدود و قیود کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔

۲۔ **دوسرا فرق** یہ کہ خاندانی نظام کے تحت عموماً اشیاء و خدمات کا تبادلہ بلا معاوضہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ تبادلہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ ۔ اور معاشرتی نظام میں عمومی طور پر اشیاء و خدمات کی براہ راست خرید و فروخت ہوتی ہے اور مختلف پیمانوں اور میزانوں کے ذریعے قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاشرتی نظام محض خود غرضی اور مادی مقاصد پر قائم ہوتا ہے۔ بلکہ بنیادی اصول یہ کہ دونوں نظاموں میں اخلاص، عدل اور مکمل خیر خواہی کا وجود از حد ضروری ہے البتہ مذکورہ فرق کا تعلق ظاہری پیمانوں کے اعتبار سے ہے کہ خاندانی سطح پر خدمات کا تبادلہ کسی عوض کے حصول کے لئے نہیں ہوتا بلکہ فطری تعلق کی بنا پر ہوتا ہے۔ مگر معاشرتی سطح پر جو شخص اخلاص کے ساتھ اور ایک معاہدہ کے تحت کوئی خدمت انجام دیتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی خدمت اور محنت کا ظاہری معاوضہ بھی وصول کرے۔

۳۔ **تیسرا فرق** یہ کہ خاندانی تعلقات فطری لحاظ سے مستقل ہوتے ہیں۔ ان رشتوں میں تبدیلی پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ نزدیکی اور دوری ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ باپ ہمیشہ باپ اور بیٹا ہمیشہ بیٹا رہتا ہے خواہ جتنی دوری اختیار کر لی جائے۔ لیکن معاشرتی روابط غیر مستقل ہوتے ہیں۔ ان کے لین دین اور شراکت داری میں آئے دن تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

اس حوالے سے میاں بیوی کا رشتہ بظاہر اگرچہ ایک اختیاری معاہدہ کے تحت معرض وجود میں آتا ہے اور انسانی تقاضوں کی وجہ سے طلاق و فرقت کی شکل میں اس تعلق میں کراہت کے ساتھ انقطاع اور تبدیلی کو جائز کہا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ رشتہ قرابت داری کی بنیاد اور خاندانی نظام کی خشت اوّل ہے۔ اسی کی وجہ سے والدین، اولاد اور بہن بھائیوں کے تمام تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور اس کے انقطاع سے باقی رشتے متاثر ہوتے ہیں اور انسانی فطرت اس کے انقطاع کو ناپسند کرتی ہے۔ اس لئے اسلام میں مجموعی طور پر ازدواجی رشتہ کو بھی رشتۂ ولادت کی طرح کا تقدس دیا گیا ہے۔ حرمت مصاہرت اور احکام میراث اس کے اہم پہلو ہیں اور نفقہ کے احکام میں تو اسے باقی تمام رشتوں پر فضیلت و فوقیت دی گئی ہے۔

خاندانی اور معاشرتی اداروں کے مذکورہ فرق کے پیش نظر اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ازدواجی اور خاندانی تعلقات کو سرمایہ دارانہ ذہنیت سے ناپا تولا جائے یا ان کی خدمات کی خرید و فروخت کی جائے۔ اور یہی فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کو ماں کے دودھ یا ماں کی تربیت کا متبادل دیا جائے تو اس کی صحت اور اس کے مزاج میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر حادثاتی طور پر کوئی بچہ ان چیزوں سے محروم ہو جائے تو اسے خاندان کے اندر رکھتے ہوئے اس محرومی کا بہتر علاج ممکن ہوتا ہے لیکن جان بوجھ کر پورے معاشرے کو خاندانی خدمات اور اعلیٰ اقدار سے محروم کرنا نئی نسل کے اجتماعی فساد کا موجب ہے۔ جدید تہذیب میں جس کا واضح مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی نظام حیات میں ضرورت مند افراد کے اخراجات کی ذمہ داری خاندانی اور معاشرتی دو مختلف شعبوں میں منقسم ہوتی ہے، ایک کنبے کا سرپرست اپنے اہل و عیال اور حاجت مند اہل قرابت کی بنیادی ضروریات کا ذمہ دار ہوتا ہے جبکہ معاشرے کے دوسرے ضرورت مند افراد کے اخراجات کی ذمہ داری ارباب اقتدار پر عائد کی جاتی ہے۔ ان دونوں میں سے اوّل الذکر ذمہ داری اسلام کا قانون نفقہ ہے جس کا تعلق انسان کی خاندانی اور عائلی زندگی سے ہے۔

نفقہ کے لغوی معنی فنا ہو جانے اور مٹ جانے کے ہیں۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے:" **نفق ماله ودرهمه وطعامه "اى نفد وفنى وذهب"**[۲]

ترجمہ: اس کا مال ختم ہو گیا، مٹ گیا اور اس کے قبضہ سے نکل گیا۔

اس حوالہ سے اس لفظ کی نسبت مال کی طرف ہو تو مال خرچ کرنے کے معانی لیے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے: ﴿**وَأَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم**﴾ [۳]

ترجمہ: جو ہم نے تمھیں رزق دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:**((اَ عظمُها أجراً الذى أنفقته على أهلك))** [۴]

ترجمہ: سب سے بڑا ثواب اس میں ہے جو تم اپنے گھر والوں پر خرچ کرتے ہو۔

دوسرے مقام پر رسول اللہ ﷺ فرمایا:**((أفضل الدينار ينفقه الرجل على عياله))** [۵]

ترجمہ: جو رقم ایک شخص اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے وہ رقم زیادہ فضیلت کی حامل ہے۔

لفظ نفقہ اسی مادہ سے اسم مصدر ہے، اس کی جمع نفقات، نفاق اور انفاق آتی ہیں[۶]۔

اس کا فقہی اصطلاحی مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے:

۱۔ محمد شربینی خطیبؒ لکھتے ہیں: **"هوالإخراج ولا يستعمل إلا فى الخير"** (۷)

ترجمہ: اس سے مراد بھلائی کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔

۲۔ علامہ ابن ہمامؒ نفقہ کی وضاحت یوں کرتے ہیں: **"الإدرار على الشيء بما به بقائه"** (۸)

ترجمہ: جن چیزوں پر زندگی کی بقاء کا مدار ہو وہ چیزیں مسلسل مہیا کرنا۔

۳۔ حنبلی فقہ کے امام ابراہیم بن محمد بن سالم بن ضویان لکھتے ہیں:

"مايجب على الإنسان من النفقة بالنكاح والقرابة والملك" (۹)

ترجمہ: نفقہ سے مراد وہ اخراجات ہیں جو ایک انسان پر نکاح، قرابت داری یا ملکیت کی وجہ سے واجب ہوتے ہیں۔

۴۔ شیخ محمد بن حسن بنانی مالکی نفقہ کی تعریف کرتے ہیں:

"النفقة مابه قوام معتاد حال الآدمى دون سرف" (۱۰)

ترجمہ: ایک انسان عمومی عادت کے مطابق اور فضول خرچی کے بغیر ان چیزوں کا خرچہ اُٹھائے جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہو۔

۵۔ علامہ منصور بن یونس بہوتی رقم طراز ہیں:

"كفاية من يمونه خبزاً وإداماً وكسوة ومسكناً وتوابعها" (۱۱)

ترجمہ: زیر کفالت لوگوں کو خوراک، لباس، رہائش اور ذیلی اشیاء اتنی فراہم کی جائیں جو ان کے لیے کافی ہوں۔

۶۔ سعودی عرب کے قانون ساز ادارہ، **"إدارة البحوث العلمية"** کے رکن صالح بن فوزان اس تعریف کو عرف وعادۃ کی قید کے اضافہ کے ساتھ زیادہ جامعیت سے یوں پیش کرتے ہیں:

"كفاية من يمونه بالمعروف قوتا وكسوة وسكنا وتوا بعها" (۱۲)

ترجمہ: زیر کفالت افراد کو عرف کے مطابق خوراک، لباس، رہائش اور اس کی ذیل اشیاء اس طرح مہیا کی جائیں کہ ان کے لیے کافی ہوں۔

ان تمام تعریفوں کی مدد سے شرعی نفقہ کی درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

i. ایک شخص دوسرے شخص کا خرچہ مسلسل اُٹھائے۔
اس خرچہ میں اس دوسرے شخص کی وہ تمام ضروریات شامل ہوں جن پر اس کی زندگی کا انحصار ہو۔

یہ خرچہ صرف ان لوگوں کا برداشت کیا جاتا ہے جو نکاح، قرابت داری یا ملکیت اور ماتحتی کی وجہ سے کسی کی کفالت میں آتے ہوں۔

ii. یہ خرچہ ان کی ضروریات کے لیے مناسب اور کافی ہو۔

iii. یہ خرچہ عرف عام کے مطابق ہو۔

iv. اس خرچہ میں بھلائی کے کام شامل ہوتے ہیں نہ کہ خلاف شرع اور فضول اخراجات [۱۳]

ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے نفقہ کی جامع تعریف یوں کی جاسکتی ہے:

"ایک ذمہ دار فرد اپنے زیر کفالت افراد کو ان کی ضروریات زندگی کا خرچہ ذاتی طور پر اور عرف عام کے مطابق اس طرح مہیا کرے کہ وہ ان کے لیے مناسب، کافی ہو اور شرعی احکام کے مطابق ہو"۔

اس جامع تعریف میں مذکورہ بالا خصوصیات نفقہ کے علاوہ ایک نئی خصوصیت یہ شامل کی گئی ہے کہ نفقہ ذاتی اور خاندانی طور پر ادا کیا جاتا ہے نہ کہ اجتماعی طور پر۔

اس سے نفقہ اور انفاق کے درمیان کئی فرق واضح ہوتے ہیں:

i. نفقہ انفرادی طور پر صرف اپنے اہل وعیال اور زیر کفالت افراد سے مخصوص ہے اس لیے اسے کفالت خاصہ کہا جاتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ میں اس کے برعکس اجتماعی اموال کے ذریعے معاشرے کے ضرورتمندوں کی کفالت کی جاتی ہے اس کا دوسرا نام کفالت عامہ ہے [۱۴]۔

ii. نفقہ میں اپنی حیثیت کے دائرے میں رہتے ہوئے مکمل کفالت کی جاتی ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ میں کسی کی کفالت میں اپنا مخصوص حصہ شامل کیا جاتا ہے۔ جیسے زکوٰۃ دینے والا کسی مسکین کی کفالت کا ذمہ نہیں اُٹھاتا بلکہ اپنی آمدنی کا محض مخصوص حصہ سرکاری بیت المال میں جمع کرانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

iii. نفقہ میں ایک فرد کسی مستحق کی ضروریات کا مسلسل ذمہ دار رہتا ہے تا آنکہ کسی وجہ سے اس کی ذمہ داری کا اختتام ہو جائے لیکن انفاق فی سبیل اللہ میں ایک فرد اپنا حصہ جمع کرا کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا۔

iv. نفقہ ایک شخص پر اس کی مالی استطاعت کے مطابق ہر حال میں واجب ہوتا ہے خواہ وہ خوش حال ہو یا تنگ دست۔ اس لیے عرف کے مطابق امیر اور غریب کے نفقہ کی ذمہ داری میں فرق پایا جاتا ہے جبکہ انفاق فی سبیل اللہ صدقات واجبہ کی صورت میں صرف صاحب نصاب پر فرض ہوتا ہے۔

v. نفقہ کی مقدار اپنے وقت اور حالات کے ساتھ بدل جاتی ہے اس میں زیر کفالت افراد کی ضروریات و حاجات ان کی معاشی سطح کے مطابق پوری کی جاتی ہیں اس کے برعکس زکوٰۃ، عشر، خمس اور دیگر صدقات واجبہ میں اپنے مال کی ایک خاص شرح ادا کی جاتی ہے[۱۵]۔

vi. اسلام کے نظام نفقہ میں اہل و عیال اور حاجت مند اہل قرابت کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی تمام بنیادی ضروریات شامل ہیں جن کی کیفیت و کمیت مختلف اوقات و احوال میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اسلامی قانون نفقہ میں ان تمام احوال کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

نفقۂ بیوی:

قانون نفقہ کے دو اہم حصے ہیں: نفقۂ بیوی اور نفقۂ اقارب۔ اس لئے دونوں کے مختلف فطری احوال کی وجہ سے وجوب نفقہ کے اسباب، شرائط، قواعد وضوابط، نفقہ کی مقدار اور اس کے دائرۂ کار میں دونوں کا فرق ہے۔ بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ڈالی گئی ہے جو نکاح اور بیوی کی رخصتی سے لے کر دونوں کی جدائی کی عدت یا دونوں میں سے کسی کی وفات تک جاری رہتی ہے اور بیوی کے مالدار ہونے کے باوجود بھی قائم رہتی ہے۔ بیوی کا نفقہ میاں بیوی دونوں کے معاشرتی معیار کے مطابق جبکہ اقارب کا نفقہ بوقت ضرورت اور بقدر کفایت واجب ہوتا ہے۔

اسلام نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد و عورت کی حیثیت سے جوڑے کی شکل میں تخلیق کیا ہے۔ یعنی انسان کی یہ دونوں اصناف و اجناس اپنی زندگی کے قیام کے لئے برابر طور پر ایک

دوسرے کی محتاج ہیں۔ اس لئے میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کا آغاز دونوں کے باہمی رضامندانہ معاہدہ سے ہوتا ہے جسے نکاح کا نام دیا گیا ہے۔

نکاح کے ذریعے دونوں کے مابین ایسے مشترکہ منافع اور حقوق و فرائض قائم ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کا بدل ہیں اور دونوں کی فطری ساخت کے مطابق ہیں کہ شوہر پر بیرون خانہ اور بیوی پر اندرون خانہ کی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں اور مرد کسب معاش سے بیوی کا نفقہ ادا کرتا ہے۔ اس لئے بیوی کا نفقہ کسی ضرورت مند کی مدد اور تعاون کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق "نفقہ" بیوی کا وہ حق منصبی ہے جو ایک فریضہ کے طور پر مرد کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"إن المرأة محبوسة بحبس النكاح حقاً للزوج، ممنوعة من الاكتساب بحقه فكان نفع حبسها عائد إليه فكانت كفايتها عليه "[16]

ترجمہ: بیوی نکاح کی وجہ سے شوہر کے حقوق کی ادائیگی کے لئے پابند ہے، اس کے لئے ایسا کسب معاش ممنوع ہے جس سے شوہر کے حقوق تلف ہوں اور اس کی اس پابندی سے شوہر فائدہ اُٹھاتا ہے اس لئے بیوی کی مالی کفالت شوہر پر لازم آتی ہے۔

معروف فقیہ مصطفی احمد زرقاؒ لکھتے ہیں:

"والزواج علاوة على مايثبت به من حل الاستمتاع بين الزوجين، ينشئ حقوقا ووجائب متقابلة بينهما من مالية وأسرية؛ منها نفقة الزوجة" [17]

ترجمہ: نکاح اور شادی کے ذریعے زوجین کے درمیان[مشترکہ] منافع کی حلت کے علاوہ، ایسے حقوق و فرائض قائم ہوتے ہیں جو دونوں کے مابین ایک دوسرے کے بدلے میں ہیں، وہ حقوق و فرائض مال اور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور نفقہ انہیں میں ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ [18]

ترجمہ: مرد عورتوں کے نگران ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لیے مرد اپنے اموال ان پر خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں مردوں کو قوام کہا گیا ہے جس کے معنی نگران اور محافظ کے ہیں[۱۹]۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا مادہ دین اور نماز کے مکمل نظام کے قیام کی مناسبت سے بھی ذکر کیا گیا ہے[۲۰]۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گھریلو اور خاندانی نظام کے قیام کے لیے مردوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے تمام ضروری اخراجات اس طرح برداشت کریں کہ ان کی زندگی کو مکمل طور پر تحفظ حاصل ہو جائے۔ اس طرح خاندانی نظام کے بقاء واستحکام کے نقطۂ نظر سے مرد کو عورت پر سربراہ کی حیثیت دی گئی ہے اور عائلی قوانین کی بنیاد اسی بات پر رکھی گئی ہے۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر کی حیثیت سے صحیح بخاری کی درج ذیل حدیث زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ الْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا))[۲۱]

ترجمہ: تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور وہ اپنی نگرانی کے بارے میں جوابدہ ہو گا، پس حکمران اپنی رعایا کا نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا، اسی طرح مرد اپنے اہل و عیال کا نگران ہے اور وہ بھی اس سلسلے میں جوابدہ ہو گا اور بیوی بھی اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اس سے بھی اس کی ذمہ داری کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اس حدیث سے مرد کے لیے گھریلو نظام کی دیکھ بھال اور ذمہ داری کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کا مرتکب ہو گا تو اس کے خلاف بیوی کو شکایت کرنے کا اور مقتدر قوتوں کو سوال کرنے اور سزا دینے کا حق حاصل ہو گا اور اُخروی حوالے سے بھی اس کی کوتاہی کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمان نبوی ہے:

((كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يَحْبِسَ، عَمَّنْ يَمْلِكُ قُوتَهُ))[۲۲]

ترجمہ: ایک شخص کے گناہ گار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے زیر کفالت لوگوں کا نفقہ ادا نہ کرے۔

بیویوں کی ذمہ داری کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ (۲۳)

ترجمہ: نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمانبردار ہوں اور شوہر کی عدم موجودگی میں اللہ کے محفوظ کردہ امور کی حفاظت کرنے والی ہوں اور جن عورتوں کی سرتابی کا تمھیں اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، ان سے اپنی آرام گاہیں الگ کرلو اور انہیں ضرب لگاؤ، جب وہ دوبارہ تمھاری فرمانبرداری اختیار کرلیں تو تمھیں ان کے خلاف کسی قسم کی کاروائی کی اجازت نہیں ہے۔

اس آیت مبارکہ میں ازدواجی زندگی کے بہت سے احکام کو اجمالی اور اصولی انداز بیان میں سمو دیا گیا ہے، اس میں بیوی کو اپنے شوہر کی ایسی نافرمانی سے منع کیا گیا ہے جس سے دین، خاندان اور شوہر کے حقوق متاثر ہوں اور اس بنا پر شوہر کو اصلاحی اختیارات دے کر یہ حکم دیا گیا کہ وہ بغاوت اور کھلے معاصی کی صورت میں از خود معمولی سرزنش کا اختیار رکھتا ہے لیکن جب بیوی اللہ کی اطاعت گزار اور شوہر کی فرمانبردار ہو تو اس سے ناانصافی اور زیادتی کرنا ظلم اور قابل گرفت ہے۔

معلوم ہوا اسلامی تعلیمات کے مطابق میاں بیوی دونوں کے فرائض کا تعین کرکے شوہر کو گھریلو جملہ امور میں اللہ کے احکام کی حفاظت کے لئے نگران مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اضافی ذمہ داری درحقیقت مرد کے کندھوں پر اللہ تعالیٰ کی امانت کا بوجھ ہے تاکہ مرد زیادہ احساس ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے بیوی کی شخصی آزادی کا مکمل خیال رکھے، یک طرفہ طور پر اپنی خواہشات اس پر مسلط نہ کرے بلکہ اپنے اور بیوی کے حقوق کی تکمیل میں اصلاحی کردار ادا کرے تاکہ گھریلو امور میں دونوں کی یکجہتی سے ایک نہایت پرسکون ماحول پیدا ہو، دونوں ہر قسم کی غیر اخلاقی وابستگی اور بے راہ روی سے محفوظ رہیں، ان کی سرپرستی میں تربیت پاکر صالح نسل پروان چڑھے۔

اس پس منظر میں فقہاء اسلام نے بیوی کے نفقہ کا سبب، شرائط اور اس کے قواعد وضوابط منضبط کئے ہیں، شوہر اور بیوی دونوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے مختلف احوال میں نفقہ کے احکام بیان کئے ہیں، مثلاً شوہر اور بیوی کی کم سنی، بیماری، عدم موجودگی، ان کا غیر مسلم ہونا، بیوی کی نافرمانی یا اس کی عدت کی مختلف صورتیں، بیوی کی طرف سے شوہر کو نفقہ کی ذمہ داری سے بری کرنا، بیوی کا سابقہ نفقہ اور اس طرح

کی کئی اور صورتیں جن میں سے بعض میں نفقہ کے وجوب کا اور بعض صورتوں میں عدم وجوب کا حکم دیا گیا ہے۔ اور انہیں احکام میں فقہاء کی آراء میں اختلاف بھی پیدا ہوا ہے۔ یہ تمام تفصیلات کتب فقہ میں موجود ہیں۔

نفقۂ اقارب:

اقارب کا نفقہ بھی بیوی کے نفقہ کی طرح کتاب و سنت کی روشنی میں بالاتفاق تمام فقہی مکاتب کے قوانین کے مطابق واجب ہے۔ البتہ اقارب کے دائرہ کار میں فقہائے اسلام کی چھ مختلف آراء موجود ہیں:

i. فقہائے مالکیہ کے نزدیک بیوی کے نفقہ کے علاوہ، اولاد کا نفقہ والد پر اور والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے۔ اس کے علاوہ کسی قرابت دار کا نفقہ واجب نہیں۔

ii. شوافع کہتے ہیں کہ اصولی اور فروعی اقارب کا نفقہ ضروری ہے۔ ان کے علاوہ کسی کا نفقہ واجب نہیں ہے۔

iii. امام اوزاعیؒ کا موقف ہے کہ ہر ضرورت مند رشتہ دار کا نفقہ ادا کرنا اس کے صرف قریبی مذکر عصبہ کی ذمہ داری ہے۔

iv. حنابلہ کے ہاں غیر عمودی ذوی الارحام کے علاوہ باقی تمام اقارب کا نفقہ لازم ہے۔

v. پانچواں قول احناف کا ہے کہ ہر نادار رشتہ دار کا نفقہ اس کے قریبی محرم رشتہ داروں پر واجب ہے، غیر محرم اقارب کا نفقہ واجب نہیں۔

vi. چھٹا مذہب امام ابن حزمؒ کا ہے، امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ نفقہ کی ذمہ داری سے کوئی رشتہ دار بھی مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ تمام اقارب جس طرح میراث کے مستحق ہیں اسی طرح وہ باہم ایک دوسرے کے نفقات کے ذمہ دار بھی ہیں۔

فقہائے کرام کی مذکورہ چھ آراء کا خلاصہ یہ کہ تمام مذاہب نفقۂ اقارب پر متفق ہیں مگر ان میں سے ابتدائی پانچوں مذاہب نے اپنے مخصوص رجحان اور مخصوص دلائل کی بنا پر بعض اقارب کو نفقہ کی ذمہ داری سے مستثنا قرار دیا ہے۔ جیسا کہ شوافع نے غیر عمودی اقارب، اوزاعیہ نے غیر عصبات، حنابلہ نے غیر عمودی ذوی الارحام اور حنفیہ نے غیر محرم اقارب کے نفقہ کے عدم وجوب کا قول اختیار کیا ہے۔

جبکہ ظاہر یہ کسی ذی قرابت کو خارج کئے بغیر تمام اقارب کو درجہ بدرجہ نفقہ کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ کتاب وسنت، صحابہ کرامؓ کے عمومی رجحان اور مقاصد شرعیہ کے پیش نظر آخری قول قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے، اس لحاظ سے درج ذیل دلائل قابل ذکر ہیں:

۱۔ آیت مبارکہ ہے: ﴿ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ﴾ (۲۴)

ترجمہ: بچوں کے باپ پر لازم ہے کہ وہ بچوں کی ماؤں کو معروف طریقے کے مطابق ان کا کھانا اور ان کا لباس فراہم کرے، کسی انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی، بچے کی وجہ سے اس کی ماں اور اس کے باپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے اور باپ کی عدم موجودگی میں بچے کی ذمہ داری اس طرح ان کے وارث پر ہوگی۔

اس آیت میں پہلے یہ بتایا گیا کہ بچے کی وجہ سے اس کی ماں کا نفقہ واجب ہے۔ اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ بچے کی وجہ سے اس کے والدین ایک دوسرے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں۔ آخر میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ بچے کے باپ کی عدم موجودگی میں ان کے وارث پر اسی طرح کی ذمہ داری ہوگی۔

۲۔ اسی طرح اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ﴾ (۲۵)

ترجمہ: اپنے رشتہ دار کا حق ادا کرو اور ہر محتاج اور مسافر کا بھی۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس سے پہلی والی آیات میں نہایت اہتمام سے والدین کے حقوق بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد اس مقام پر والدین اور مساکین کے حقوق کے درمیان اقارب کے حقوق کی ادائیگی کا حکم موجود ہے جبکہ اولاد کا علیحدہ تذکرہ نہیں کیا گیا بلکہ اقارب کے ذکر میں اولاد کا ذکر بھی شامل ہے۔ اب یہ بات بھی تو مسلّم ہے کہ والدین اور اولاد کا نفقہ واجب ہے، ان کو زکوٰۃ بھی نہیں دی جاسکتی جبکہ عام مساکین اجتماعی نظم کے تحت زکوٰۃ حاصل کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں اقارب کے حقوق کو اولاد کے ساتھ ملا کر اور عام مساکین سے علیحدہ بیان کر کے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کا یہ حق ہے کہ انہیں عام مساکین کی حیثیت نہ دی جائے بلکہ اولاد کی طرح انہیں نفقہ مہیا کیا جائے۔ اس لئے فقہاء نے اس آیت سے اقارب کا نفقہ ثابت کیا ہے (۲۶)۔

۳۔ احکام میراث اور احکام نفقات کو اُن کے پس منظر کے تحت دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات کا معاہدہ طے ہوا جس کے تحت ہر مہاجر اور ہر انصاری کو ایک دوسرے کی میراث کا حق دار بنایا گیا اور پھر یہ حکم منسوخ کر کے یہ فیصلہ صادر کیا گیا [۲۷]۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُوْنَ﴾ [۲۸]

ترجمہ: ہم نے والدین اور قرابت داروں کی جائیداد کا حق دار ان کے رشتہ داروں کو بنادیا ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا گیا [۲۹]

﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللهِ ﴾ [۳۰]

ترجمہ: قرابت دار ہی ایک دوسرے کے سب سے زیادہ تعلق دار ہیں۔

مذکورہ سبب نزول سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح اس آیت کے نزول سے قبل مسلمانوں کی نصرت اور وراثت کا حکم مواخات کے معاہدہ سے متعلق تھا اسی طرح اس آیت کے نزول کے بعد اس نصرت اور وراثت کا حکم رشتہ داروں سے مخصوص ہو گیا اور مذکورہ آیت کا لفظ "اولیٰ" یہ ثابت کرتا ہے کہ اب نصرت اور میراث کے حوالے سے مسلمان قرابت داروں کا باہمی گہرا تعلق تسلیم کر لیا گیا ہے جس کی بنا پر انصار اور مہاجرین کی طرح ہر مسلمان قرابت دار اپنے دوسرے قرابت دار کی موت سے پہلے اس کا مددگار اور موت کے بعد اس کی میراث کا حق دار قرار پایا ہے۔

ڈاکٹر زحیلی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ان رابطة القرابة فی الدم والنسب تكون سببا للتوراث والتناصر" [۳۱]

ترجمہ: خونی اور نسبی تعلق کو میراث اور مدد کا مستحق بنادیا گیا۔

۴۔ نفقۂ اقارب کی ایک اہم دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ أَمَرَ اللهُ بِهٖٓ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ﴾ [۳۲]

ترجمہ: وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے پکا عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اور جن تعلقات کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں توڑتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشتہ داروں سے تعلقات جوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ لیکن کفار اللہ کے حکم کے خلاف ان تعلقات کو توڑ دیتے ہیں۔ معلوم ہوا قطع رحمی کفار کی بدترین صفت ہے جس کی وجہ سے اللہ کی زمین پر فساد برپا ہوتا ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔ ((لا يدخل الجنة قاطع)) (۳۳) ترجمہ: رشتوں کو توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

اسی ضمن میں صحیح حدیث ہے "تم خرچ کا آغاز اپنی ذات سے کرو، اس سے جو بچ جائے تو وہ عیال پر خرچ کرو اور پھر جو بچے اس میں سے اپنے اقارب پر صرف کرو اور اس کے بعد بھی کچھ باقی ہو وعام ضرورت مندوں پر خرچ کرو (۳۴)۔

اسی طرح یہ بھی فرمان نبوی ہے ((يوصيكم بالأقرب فالأقرب)) (۳۵) ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتے یں کہ تم درجہ بدرجہ اپنے اقارب کا خیال رکھو۔

ایسے یہ بھی حدیث مبارکہ ہے:

((وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، أُمَّكَ وَأَبَاكَ، وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ، وَأَدْنَاكَ أَدْنَاكَ)) (۳۶)

ترجمہ: اپنے اہل وعیال سے نفقہ کی ابتدا کرو یعنی اپنے والدین، بہن بھائی اور اس کے بعد والوں اور پھر اس کے بعد والوں کا نفقہ دو۔

۵۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے متعلق یہ نقل کیا گیا "جا ء يتيم إلى عمر رضى الله عنه فقال انفق عليه، قال عمر: لولم أجد إلا أقصٰى عشيرته لفرضت عليهم" (۳۷)

ترجمہ: حضرت عمر کے پاس ایک یتیم بچہ لایا گیا اور آپ سے کہا گیا کہ آپؓ اس کا نفقہ جاری کر دیں۔ آپؓ نے فرمایا اگر مجھے اس بچے کے کچھ دور کے رشتہ داروں کا بھی علم ہو گیا تو میں ان پر اس کا نفقہ واجب کر دوں گا۔

۶۔ اسلامی احکام کا ایک بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ انسانی خیر خواہی کا حصول ہے اور یہ مقصد نفقۂ اقارب سے متعلقہ شرعی نصوص کے الفاظ کی دلالت سے بھی واضح ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر پہلی آیت کا حکم ﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ﴾ نگران مرد کی وفات کے بعد اس کے بچے اور اس کی بیوہ کو تحفظ دینے کے لئے وارد ہوا ہے۔ اب اگر وارثت کے اصول کو نفقۂ اقارب سے علیحدہ رکھا جائے اور نفقۂ اقارب میں

مکمل توسیع اختیار نہ کی جائے تو کسی نہ کسی صورت میں یتیموں اور بیواؤں کے حقوق ضرور سلب ہوں گے اس لئے تمام اقارب کا نفقہ تسلیم کرنے میں قرآنی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے قطع رحمی کو ممنوع اور فساد فی الارض قرار دیا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ قریبی رشتہ داروں کی طرح دور کے رشتہ دار اور ذوی الارحام بھی نفقہ کے حق دار ہیں اور جس نے ان کی بنیادی ضروریات جان بوجھ کر فراہم نہ کر کے انہیں موت یا ذلت آمیز حالات کے حوالے کر دیا وہ قطع رحمی کا مرتکب ہو گا۔ مقالہ ہذا میں فقہاء کرام کے تفصیلی دلائل کا موازنہ پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے آخری مؤقف کی ترجیح کے طور پر مذکورہ دلائل و قرائن کافی معلوم ہوتے ہیں۔

نفقۂ اقارب کی بنیاد معاہدۂ رضامندی پر نہیں بلکہ ان فطری تعلقات اور رشتوں پر رکھی گئی ہے جنہیں انسان اپنی پیدائش کے ساتھ لے کر آتا ہے۔ نفقہ کی اس قانونی حیثیت سے اقارب کے مابین ایسے مشترکہ مالی منافع اور حقوق کا تعین ہوتا ہے جو وسیع تناظر میں ایک دوسرے کا بدل ہیں اور اقارب کے فطری احوال کے مطابق ہیں۔ اس کا مطلب یہ کہ اقارب کا نفقہ ایک خاندان کے باصلاحیت افراد کو کسب معاش پر آمادہ کر کے خاندان کے ہر فرد کے معاشرتی وقار کو بلند کرتا ہے پوری قوم میں اسراف و تبذیر کے رجحان کا خاتمہ کر کے قومی معیشت کے استحکام اور طبقاتی تقسیم کے سدباب کا ذریعہ بنتا ہے۔

مذکورہ بالا حقیقت اقارب کے نفقہ کی وہ بنیادی فلاسفی ہے جس کی بنا پر فقہ اسلامی میں نفقۂ اقارب کے سبب، شرائط اور تمام قواعد وضوابط کو مرتب کیا گیا ہے اور مختلف احوال میں اقارب کے نفقات کی توضیح کی گئی ہے۔ معلوم ہوا ''اسلامی قانون نفقہ'' اسلامی معاشرے کا ایک مرکزی ستون ہے جس کے تحت ایک کنبے اور خاندان کے تمام افراد کے جملہ لوازمات زندگی کو تحفظ حاصل ہوتا ہے، ان کے گھریلو اور خاندانی فرائض و حقوق کا تعین ہوتا ہے اور اس کے ذریعے احترام آدمیت، حریت فکر و عمل، اخوت و ہمدردی، مساوات اور عدل جیسے اسلامی اصولوں کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱) سورۃ البقرۃ:۳۰

۲) زبیدی، مرتضی، تاج العروس من جواہر القاموس، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء ص: ۱۳/ ۴۶۳؛ افریقی، ابن منظور، لسان العرب، نشرادب الحوزہ، قم، ایران، ۱۴۰۵ھ، ص: ۱۰/ ۱۱۵؛ وجدی، محمد فرید، دائرہ معارف القرن الرابع عشر دار لمعرفہ، بیروت، طبع دوم، ۱۹۷۱ء، ص: ۱۰/ ۳۴۶

۳) سورۃ المنافقون:۱۰

۴) امام مسلم، صحیح مسلم، بمع شرح منۃ المنعم، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض، ۱۹۹۹ء، ص:۲ /۹۵

۵) ایضاً، ۲/ ۹۴

۶) لوئیس معلوف، المنجد، دارالقرآن الکریم انتشارات اسماعیلیات، تہران، طبع ۲۳، ص۸۲۸؛ بدران ابوالعینین بدران، احکام الزواج والطلاق فی الاسلام، دارالمعارف، سکندریہ، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص:۲۰۸

۷) کوھجی، عبداللہ بن حسن، زادالمحتاج شرح منہاج، الشؤن الدینیہ، قطر، طبع اوّل، تاریخ طبع ندارد، ۳ /۵۶۳

۸) ابن الہمام، کمال الدین، شرح فتح القدیر، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ص: ۴ /۱۹۳۔ نوٹ: عام طور پر اہل علم نے اسی اسلوب کو نمایاں کر کے اپنے اپنے انداز میں نفقہ کی تعریف کی ہے مثلاً عبدالرحمن جزیریؒ لکھتے ہیں کہ ایک شخص پر دوسرے شخص کی وہ ذمہ داری نفقہ کہلاتی ہے جو روٹی، سالن، لباس، رہائش اور ذیلی اشیاء کی صورت میں ادا کی جاتی ہے (جزیری، عبدالرحمن کتاب الفقہ علی المذاہب الاربع، داراحیاء التراث العربی، بیروت، طبع ہفتم، ۱۹۸۶ء، ص: ۴ /۵۵۳)۔ اس طرح پاکستان کے ایک فیصلہ میں نفقہ کو یوں واضح کیا گیا کہ کسی کی بہتری کے لیے اس کے وجود، تحفظ اور بقاء کو قائم رکھنے کے لیے اس کی خوراک، لباس، رہائش اور دیگر جسمانی اور ذہنی صحت کی ضروریات کا خرچہ برداشت کرنا۔

۹) ابراہیم بن محمد بن سالم بن ضویان، منارالسبیل، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع ششم، ۱۹۸۴ء، ص: ۲ /۲۹۷

۱۰) بنانی، محمد حسین، فتح الربانی، دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع اوّل ۲۰۰۲ء، ۴ /۴۳۷؛ محمد بن علیش، شرح منح الجلیل علی مختصر الخلیل، مکتبہ النجاح، طرابلس، ص: ۲ /۴۳۰؛ محمد جمع عبداللہ، الکواکب الدریہ فی فقہاء مالکیہ، مکتبہ کلیات الازہریہ، قاہرہ، طبع پنجم، ۱۹۸۱ء، ص: ۱/ ۲۶۸

۱۱) بہوتی، منصور بن یونس، کشاف القناع عن متن الاقناع، عالم الکتب، بیروت، ص: ۵ /۴۵۹

۱۲) صالح بن فوزان بن عبداللہ، الملخص الفقہی، دارابن الجوزی، دمام، طبع پنجم، ۱۹۹۶ء، ص:۲ /۳۵۶

۱۳) ڈاکٹر تنزیل الرحمن نفقہ کی ایک اور خصوصیت بیان کرتے ہوئے نفقہ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ ایک شخص کا دوسرے شخص کی محنت کے معاوضہ میں اس کی ضروریات زندگی فراہم کرنا (ڈاکٹر تنزیل الرحمن، مجموعہ قوانین

اسلام، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، اشاعت دوم، ۱۹۶۵ء، ص: ۱/ ۳۰۷) ۔ یہ خصوصیت انہوں نے فقیہ عبدالرحمن جزیری کی طرف منسوب کی ہے۔ جبکہ جزیری کی تعریف میں یہ بات موجود نہیں ہے (دیکھئے: کتاب الفقہ، علی المذاہب اربعہ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، طبع ہفتم، ۱۹۸۶ء، ص: ۴/ ۵۵۳) راقم کی معلومات کے مطابق کسی بھی محقق عالم نے یہ قید ذکر نہیں کی کیونکہ اس کا اطلاق والدین، اولاد اور اقارب کے نفقہ پر نہیں ہوتا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاندانی نفقات میں معاوضہ حاصل کرنے کا مادہ پرستانہ تصور بطور مقصد کے موجود نہیں ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بیوی کے نفقہ میں مخلصانہ خدمات کا تبادلہ آمنے اور بلاواسطہ طور پر موجود ہوتا ہے اور باقی قرابت داروں کے مابین خدمات کا تبادلہ بالواسطہ طور پر نسل در نسل جاری رہتا ہے۔

۱۴) غفاری، ڈاکٹر نور محمد، سرمایہ دارانہ نظام انشورنس اور اسلام کا نظام کفالت، ص: ۳۵

۱۵) اس کی مختصر وضاحت یہ کہ جمع پونجی اور مال تجارت میں سالانہ اڑھائی فیصد، غیر بارانی اراضی کی ہر فصل پر پانچ فیصد، بارانی زمین کی ہر فصل میں دس فیصد اور مال غنیمت اور خزائن میں بیس فیصد صدقات واجبہ ہوتے ہیں مفتی محمد شفیع، احکام زکوٰۃ، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۲

۱۶) کاسانی، بدائع الصنائع، دارالکتب العربی، بیروت، طبع دوم، ۱۹۷۴ء، ص: ۴/ ۱۶

۱۷) زرقاء، المدخل الفقہی العام، مطابع الف باء، الادیب، دمشق، طبع نہم، ۱۹۶۸ء، ص: ۲/ ۵۶۴

۱۸) سورۃ النساء: ۳۴

۱۹) مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی تحریر فرماتے ہیں "الناظر علی الشئی والحافظ له"، آلوسی، محمود، روح المعانی دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول، ۱۹۹۴ء، ص: ۳/ ۲۴

۲۰) الشوریٰ: ۱۳

۲۱) بخاری، الجامع الصحیح، ص: ۳۸۷، حدیث نمبر ۲۴۰۹

۲۲) مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، بمع منۃ المنعم، ص: ۲/ ۹۵

۲۴) سورۃ النساء: ۳۴

۲۵) سورۃ البقرۃ: ۲۳۳

۲۶) سورۃ بنی اسرائیل: ۲۶

۲۷) ابن قیم، زادالمعاد، ص: ۵/ ۴۱۰۔ ایٹھوی، ملاجیون، تفسیرات احمدیہ، مترجم: قاری محمد عادل خاں (قرآن کمپنی لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء)، ص: ۲/ ۱۷۸

۲۹) بخاری، الصحیح الجامع، ص: ۳۶۶

۳۰) سورۃ النساء: ۳۳

۳۱) طبری، جامع البیان، مصطفی البابی الحلبی، واولادہ، مصر، طبع دوم، ۱۹۵۴ء، ص: ۱۰ /، ۵۲؛ پانی پتی، التفسیر المظہری ،دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع اوّل، ۲۰۰۷ء ، ص: ۳ / ۲۲۴

۳۲) سورۃ الانفال:۷۵

۳۳) الزحیلی، التفسیر الوسیط، دارالفکر، دمشق، طبع اوّل، ۲۰۰۱ء، ص:۱/ ۸۲۷

۳۴) البقرۃ: ۲۷

۳۵) بخاری، الصحیح الجامع، ص: ۱۰۴۸ ؛ترمذی، السنن، دارالسلام، ریاض، طبع اوّل، ۱۹۹۹ء،، ص: ۴۴۶

۳۶) مسلم، الصحیح الجامع، مع منۃ المنعم، ص: ۲ / ۹۵؛ نسائی، السنن، ص:۳۵۲

۳۷) بیہقی، السنن الکبری، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، طبع اوّل، ۱۹۳۵ء ص: ۸/ ۲

۳۸) نسائی، السنن، ص:۳۵۰؛ ہیثمی، علی بن محمد، نورالدین، مجمع الزوائد، دارالکتب، بیروت، ص: ۳/ ۱۲۰؛ البناء احمد عبدالرحمن، الفتح الربانی لترتیب مسند احمد، خادم السنۃ السنیۃ، مصر، طبع اوّل، ۱۳۷۱ھ، ص: ۱۵/ ۶۲

۳۹) ابن ابی شیبہ، مصنف، تحقیق: سعید اللحام، دارالفکر، بیروت، ص: ۴/ ۱۶۶

****

اسلام کا تصور تعلیم و تربیت

Concept of Education & Training in Islam

ارم سلطانہ*

ABSTRACT

Education has been considered of primary importance in human life. Religion and education are interrelated. A civilized society requires educational revolution in behavior of human beings. Education creates awareness about the human goals and real aim of life. This activity makes it possible to train the people in the right direction. Better education coupled with proper training makes a human being well-mannered and enables him to use his hidden qualities for the benefit of mankind, thus making him a beneficial not only for himself but also for the society.

The preaching of religion depends upon the education and training. Our holy Prophet ﷺ was an ideal educationist not only of his time but also for the future generations. The Holy Prophet ﷺ being a great educationist and reformer initiated the University of Suffa in Medina when the Islamic society was in its infancy. Prophet ﷺ described the conditions, pattern and qualities of a teacher. A good teacher must be interpreted as good practitioner as well.

The article deals with the moral qualities of a teacher and educationist in the light of teachings of the Prophet Muhammad ﷺ. The discussion has made clear the aim of Islamic education which is not limited within the domain of worship or prayers. Islam is a complete code of life which emphasizes the training of human being through education.

***Keywords*:** Islamic education, awareness, behavior, proper training, qualities of the teacher.

* لیکچرار شعبہ علومِ اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں اگر کسی ایک موثر ترین تاریخ ساز عامل کی تلاش کی جائے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میں سر فہرست تعلیم آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز سے اسے آراستہ کیا وہ علم تھا اور اپنے تمام انبیاء کو جو کام سونپا اس میں تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کو مرکزیت حاصل ہے۔

علم سے رشتہ توڑنے کی وجہ سے دنیا جہالت و تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ جیسا کہ اب سے چودہ سو سال پہلے دنیا اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہی تھی کسی خطۂ ارض پر رشد و ہدایت کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ پورا عالم انسانی ضلالت و گمراہی کے دلدل میں پھنس چکا تھا۔ ہندوستان کے روحانی پیشواؤں کی تعلیمات اپنا اثر زائل کر چکی تھیں۔ مصر و شام، بابل و نینوا اور یونان و چین میں تہذیب و تمدن کی شمعیں گل ہو چکی تھیں۔ روم و ایران اس وقت سب سے منظم ریاستیں تھیں لیکن ان کی تہذیب اپنی چمک دمک کھو چکی تھی۔ عرب کا حال تو اور برا تھا۔ وہاں وحشت و درندگی کا راج تھا غرض یہ کہ ہر طرف گمراہی و ظلالت چھائی ہوئی تھی۔

ان حالات میں حضرت محمد ﷺ شرف نبوت سے نوازے جاتے ہیں۔ آپ ﷺ غار حرا سے واپس آکر اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں۔ کاروان اسلام آپ ﷺ کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے۔ آپ ﷺ نے آغاز اسلام سے ہی مسلمانوں کو علم کی تحصیل کی طرف توجہ دلائی۔ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ آپ ﷺ کے ترغیب دلانے سے لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی کوششوں سے بہت سے لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے اور آگے چل کر عرب کے یہ جاہل دنیا کے معلم بن گئے۔ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے انہوں نے دنیا کو علم و فکر کے وہ خزانے دیئے للزرکشی ن کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ لوگ جو ریگستانوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے انہوں نے دنیا کو تہذیب و تمدن کے معیار سے روشناس کیا وہ لوگ جو بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے انہوں نے دنیا کو سائنس، صنعت و حرفت اور علوم و فنون کا سبق سکھایا اور ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ یہ سب نبی ﷺ کی تعلیم و تربیت کی بدولت ممکن ہوا۔

آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ پھر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید سے آپ ﷺ کے لیے وہ بہترین امت بن گئے جسے لوگوں کی اصلاح کے لیے نکالا گیا کیونکہ وہ اسی

تربیت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان، کتاب و سنت پر کماحقہ عمل اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کے لیے سچے عزم کی صفات سے متصف ہو گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توصیف یوں بیان فرمائی کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۱)

ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

تعلیم کے لغوی معنی

تعلیم کا لفظ علم سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا جاننا اور ادراک کرنا لغت کی رو سے علم کے معنی معلوم کرنے یا جاننے کے ہیں چنانچہ تعلیم کے لغوی معنی معلومات بہم پہنچانا اور علم سے مستفید کرنا ہے (۲)۔ سکھانا، تفہیم، تلقین، ہدایت، تہذیب، آراستگی، علم سکھانا (۳) سکھانا، بتانا، تلقین، ہدایت، تربیت (۴)۔

تعلیم مصدر ہے۔ اس کا مادہ علم ہے۔ یہ جہل کی ضد ہے۔ مفردات میں ہے۔ "**العِلْمُ: إدراك الشيء بحقيقته**" (۵) (کسی شے کی حقیقت کا ادراک علم ہے)۔

لفظ تعلیم عربی زبان کے لفظ علم سے نکلا ہے۔ علم کے معنی سکھانے کے ہیں۔ یہ لفظ سکھانے کے علاوہ اپنے اندر اور بھی معانی رکھتا ہے مثلاً کسی چیز کو کماحقہ جاننا اور پہچاننا، حقیقت کی گہرائی تک پہنچنا معلومات حاصل کرنا۔ اردو انسائیکلوپیڈیا میں تعلیم کے لغوی معنی کسی کو کچھ بتانا، پڑھانا یا سکھانا ہے صحیح معنوں میں تعلیم سے مراد وہ تمام اثرات ہیں جو کسی قوم کے بالغ افراد اپنی نئی نسل میں اس غرض سے پیدا کریں کہ قوم کے بچے صحیح طور پر نشوونما حاصل کریں (۶)۔

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کی تعریف

اصل اسلامی نقطہ نگاہ سے علم کا حقیقی سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے وحی سب سے بڑا واسطہ، حواس، عقل اور تجربہ علم کے بہت بڑے ذرائع ہیں مزید براں علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں مقاصد حیات سے بھی ہے (۷)۔

☆ ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی: "اسلامی تعلیم وہ ہے جو انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی، جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے مادی کائنات میں اس طرح تصرف کے قابل بنائے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ اور رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اُخروی فلاح حاصل ہو" (۸)۔

"انسان کو عمدہ اخلاق سے مزین کر کے فلاح و سعادت کے راستے پر ڈالا جائے اور اس کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع کیے جائیں" (۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کے بغیر انسان نہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کر سکتا ہے اور نہ اپنی پہچان، انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اس شرف کو قائم رکھنے کے لیے اسے تعلیم کی شدید ضرورت ہے تاکہ وہ زندگی گزارتے ہوئے ایک ارفع نصب العین کو سامنے رکھ سکے (۱۰)۔

انسان میں نیکی کی صلاحیت فطرتاً موجود ہے تعلیم کا یہ کام ہے کہ وہ انسان میں پہلے سے موجود نیکی کو بروئے کار لائے اور اس نیکی کو تحریک دے حقیقت میں انسانی فکر و عمل کی تمام صلاحتیوں کو خیر کی طرف منتقل کر دینے کا نام تعلیم ہے (۱۱)۔

قدیم مفکرین تعلیم کی آراء

☆ سقراط: (Socrates) "تعلیم سچائی کی تلاش میں مدد دینے کا نام ہے"۔

☆ ارسطو: (Aristotle) "تعلیم بچے کی یاداشت، عادات اور خیالات کے ساتھ ساتھ اس کی عقلی اور اخلاقی نشوونما کا عمل ہے"۔

☆ افلاطون: (Plato) "تعلیم معاشرے کی متوازن تنظیم کا عمل ہے" (۱۲)۔

مسلمان مفکرین تعلیم کی اراء

☆ امام غزالی : "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسانی کردار کی نشونما اسلامی خطوط پر ہو اور اس کی مدد سے انسان کو آخرت کی تیاری میں مدد ملے" (۱۳)۔

☆ ابن خلدون :

(۱) عرفان الٰہی تعلیم کی بنیاد بنائی جائے۔

(۲) زندگی کا قرآنی انداز فکر نظام تعلیم کا سنگ بنیاد ہو۔

(۳) مختلف علوم نے جو حقائق پیش کیے ہیں ان کو اسی اصول کی کسوٹی پر پرکھنا ہو گا۔

(۴) اگر اسلام کے دیے ہوئے اصولوں، اقدار اور بعض علوم سے بر آمد ہونے والے نتائج و افکار کے مابین کوئی اختلاف پیدا ہو تو اسلام کے دیے ہوئے اصولوں اور اقدار کو فضیلت دی جائے (۱۴)۔

☆ شاہ ولی اللہ: " تدریس کے دوران استاد کو طالب علم کی ہمہ جہت اور متوازن نشو و نما کا خیال رکھنا چاہیئے" (۱۵)۔

☆ علامہ اقبال: "تعلیم وہ عمل ہے جو انسان کو دین کے ماتحت رکھتے ہوئے اس کی طبعی قوتوں کی نشو و نما کے فرائض انجام دے۔ تعلیم نام ہے ادراک ہستی کرنے کا، یعنی زندگی کیا ہے؟ اس کی تخلیق کیوں عمل میں آئی؟ اس میں کیا کیا طاقتیں اور صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں؟" (۱۶)۔

تعلیم کے مقاصد

ہر کام میں مقصد کا تعین نہایت ضروری ہے کیونکہ منزل کے تعین کے بغیر کوئی سفر کار آمد نہیں ہوتا۔ تعلیمی سفر کے لیے بھی منزل کا تعین ضروری ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہے جو حب الٰہی، اطاعت رسول اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہوں (۱۷)۔

تعلیم کا صحیح مقصد "اللہ تعالیٰ کا صالح بندہ بنانا ہے" تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں نیز انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ان کے خالق و مالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کماحقہ عہدہ برآ ہو سکیں (۱۸)۔

تعلیم حیات انسانی کا وہ تجربہ ہے جس پر اس کے وجود اور بقا کا انحصار ہے تعلیم ہی وہ عمل ہے جو حیات انسانی کے قافلے کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ ایک نسل کے تجربات دوسری نسل تک پہنچتے ہیں اور تعلیم ہی وہ اساس ہے جس پر حیات انسانی کی عمارت قائم ہے (۱۹)۔

تعلیم کا مقصد یہ ہے کے وہ فجور کے میلانات کو کمزور و بے اثر کر دے اور تقوی کے میلانات کو اتنا طاقتور کر دے کہ انسانی سیرت کی پوری اٹھان اس کی رہنمائی میں ہو (۲۰)۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ طالب علم میں یہ صلاحیت پیدا کر دے کہ وہ اپنا ایک نظام قدر خود بنا سکے (۲۱)۔

تعلیم صرف کتابیں پڑھانے کا نام نہیں ہے بلکہ تعلیم یہ ہے کہ جو علم ہم کو اپنے اگلوں سے پہنچا ہے جو تہذیب، جو عقائد، افکار، عادات، خصائل، جو کچھ ہم کو اپنے اسلاف سے ملا ہے اس کو آگے آنے والی نسل تک اچھی طرح سے صحیح شکل میں عمدگی اور پوری دیانتداری کے ساتھ پہنچائیں اور نئی نسل اس راستے پر آگے بڑھ سکے جس راستے پر اس امت کا آگے بڑھنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۲۲)۔

ترجمہ: تم خیر اُمت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے اور برے کام کرنے سے روکتے ہو۔

لہذا مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ امت مسلمہ کو خیر امت بنایا جائے تا کہ وہ نیک کام کرنے کا حکم دے اور برے کام کرنے سے روکے (۲۳)۔

اکبر الہ آبادی کہتے ہیں : دل بدل جائیں گئے تعلیم بدل جانے سے

تربیت کے لغوی معنی

تربیت کا مادہ "رب" ہے جس کے کئی معنی ہیں مثلاً امام راغب اصفہانی کے نزدیک "رب" کا مطلب ہے پالنے والا اور پروردگار جو کسی چیز کی تدریجاً اس طرح تربیت کرئے کہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے (۲۴)۔ اسی طرح رب کے معنی اضافہ ہونا یا بڑھنے کے بھی ہیں پرورش پانے کے بھی ہیں اور بالادست ہونے اور انتظام کرنے کے بھی ہیں (۲۵)۔

لفظ تربیت اسم مؤنث ہے جس کے معنی پرورش، پالن، تعلیم، تادیب، تعلیم اخلاق اور تہذیب کے ہیں (۲۶)۔ تربیت سے مراد تزکیہ اخلاق وادب، روش و عمل ہے جبکہ تعلیم سے مراد معلومات ہے (۲۷)۔

تربیت کے اصطلاحی معنی

اصطلاح میں انسان کی نہفتہ صفات کی صحیح پرورش کو تربیت کہتے ہیں اس اصطلاحی معنی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ تربیت میں کسی نئی چیز کو بنایا نہیں جاتا بلکہ موجودہ صفات کی صحیح طرح سے پرورش کی جاتی ہے (۲۸)۔

تربیت اپنے شرعی مفہوم کے اعتبار سے انسانی نفس کی اصلاح اور اس کے "روح عقل و جسم" تمام پہلوؤں کی نشو نما کر کے اس کو حد کمال تک پہنچا دینے کا نام ہے (۲۹)۔

تربیت کی تعریف:

مشہور فلاسفر اور ماہرین تعلیم نے تربیت کے مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے:

☆ ارسطو:(Aristotle) "تربیت عقل کو حصول علم کے لیے تیار کرتی ہے جس طرح زمین کھیتی باڑی کے لیے تیار کی جاتی ہے"۔

☆ جان ملٹن(John Milton): "تربیت وہ جوہر ہے جو انسان کو ہر کام کا اہل بنا دیتا ہے خواہ وہ کام کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ یہ طبیعت میں گہرائی سوجھ بوجھ اور مہارت پیدا کرتی ہے خواہ امن کا زمانہ ہو یا جنگ کا ہو" (۳۰)۔

☆ جولیس سائمن(Joules Simon): "تربیت سے عقل درجہ کمال کو پہنچاتی ہے اور قلب ارتقاء کے آخری مدارج طے کرتا ہے"۔

☆ پستالوزی :(Pestalozzi) "تربیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو حیات کاملہ برتنے کا گر سکھایا جائے" (۳۱)۔

تعلیم اور تربیت میں فرق

تربیت کے عمل اور تعلیم میں ایک ایک جہت سے فرق ہے۔ تعلیم، تربیت کے ایک جزء کی طرح ہے۔ جبکہ تربیت تعلیم پر بھی مشتمل ہے۔ تربیت اسلامیہ وہ محنت ہے جو یہ ہدف رکھتی ہے کہ تمام قوائے انسانی کو مختلف وسائل اور مشروع اسلوب سے مکمل اور باوزن نشوونما عطا کرے تاکہ انسان اپنے معاشرے کا ایک اچھا فرد بن سکے۔ یہ تربیت انسان کے تمام پہلوؤں، روح، عقل اور بدن سب کو شامل ہے (۳۲)۔

اسلام کا تصور تربیت

اسلام میں تعلیم و تربیت ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ بعض لوگ اسلامی تربیت کا محض یہ مفہوم لیتے ہیں کہ عبادات کی حد تک دینداری اختیار کی جائے اور روزہ، نماز کی پابندی کر لی جائے حالانکہ اسلام کا تصور تربیت اس سے کہیں زیادہ وسیع و ہمہ گیر ہے۔ یہ ایک جامع ترین تصور کا نام ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر محیط ہے۔ اسلام میں علم برائے علم کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلام زندگی برائے بندگی کا علمبردار ہے لہذا تعلیم کا مقصد اور ہدف یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایسے انسان تیار کرے جو اسلام کے مفہوم کے مطابق عبادت گزار

ہوں یعنی ان کا رکوع و سجود ہی نہیں بلکہ ہر عمل اور موت و حیات کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی قرار پائے[۳۳]۔

اللہ تعالیٰ کا تصور تربیت کا سرچشمہ

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ [۳۴]

ترجمہ: یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور وہ مکمل تصور حسن ہے جو انسان کی زندگی کا نصب العین اور تعلیم کا بھی صحیح نصب العین ہے اسی تصور کی محبت ہے جس سے انسان کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو انسان کو ایک مکمل زندگی کے لیے تیار کرتی ہے اور انسان کی بہترین مخفی صلاحتیوں کو اجاگر کرتی ہے[۳۵]۔

خالق کائنات کی جانب رجوع ہی نظریہ اسلامی کا محور ہے اور یہی اسلام کے نظام تربیت کا سرچشمہ اور منبع ہے اسلام انسان کا رخ اس کے خالق کی جانب کر دیتا ہے اور انسان کو یہ بتا دیتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہر ایک قوت اور طاقت کا مالک ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [۳۶]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تو خود ہی سب کا روزی رساں تونائی والا اور زور آور ہے۔

اسلام کے نظام تربیت کا مقصد

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ [۳۷]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں تعلیم و تربیت ایک واجب امر ہے کیونکہ جہنم سے بچنے کے لیے قوانین اسلامی کی تعلیم اور تکاملی کی طرف بڑھنے کے لیے تربیت ضروری ہے۔یعنی ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات ہی کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کی کوشش تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ نظام فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اس پر ڈالا ہے اس کو بھی ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے بنیں[۳۸]۔

☆ اسلامی تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان دنیا میں صالح انسان کی طرح زندگی گزارے اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو ایک مؤمن کی حیثیت سے پورا کرئے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے گریز کرئے۔

☆ اسلامی تربیت کا مقصد ایسے انسانوں کی پرورش ہے جو اپنے قول و فعل میں خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے اور اس کے اوامر و نہی کو انجام دے (۳۹)۔

☆ اسلامی تربیت کا مقصد یہ ہے کہ وہ فجور کے میلانات کو کمزور و بے اثر کر دے اور تقوی کے میلانات کو اتنا طاقتور کر دے کہ انسانی سیرت کی پوری اٹھان اس کی رہنمائی میں ہو (۴۰)۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (۴۱)۔

ترجمہ: پھر سمجھ دی اس کو بدکاری کی اور بچ کر چلنے کی۔

اسلامی تربیت میں دنیاوی زندگی کو آخرت کے لیے ایک پل کی حیثیت حاصل ہے اسی لیے تمام تربیتی مسائل اسی زندگی میں عملی جامہ پہنتے ہیں اور پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ حیات دنیوی میں انسان کو بطور کامل تربیت دی جائے۔

تعلیم و تربیت میں ہم آہنگی

علم سے مراد ذات باری تعالیٰ، ذات انسانی اور کائنات کا شعور حاصل کرنا ہے پھر اس شعور کے مطابق معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی اصلاح و تہذیب کا نام تعلیم ہے تاکہ انسان حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات ثابت ہو سکے۔ اس طرح تعلیم حیات کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے کا نام ہے۔ اسی کا نام تربیت بھی ہے۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم کو عمل میں لانے کا نام تعلیم ہے اور زیور اخلاقیات سے آراستہ ہونے کا نام تربیت ہے۔ اسلام نے بھی علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں (۴۲)۔

تعلیم کی عمارت کا ستون تربیت ہے تعلیم تربیت کے بغیر محض الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے تربیت عقل میں پختگی اور سیرت میں طہارت پیدا کرتی ہے۔

☆ احمد فواد اہوائی: "تعلیم سوائے علم کو آگے پھیلانے کے اور کچھ نہیں ہے اس سے عقل صیقل ہوتی ہے اور نفس پاکیزہ ہوتا ہے" (۴۳)۔

نبی ﷺ نے فرمایا:((أدبني ربي فأحسن تأديبي)) (۴۴) ترجمہ: میرے رب نے میری تربیت کی اور بہت اچھی تربیت کی۔

علم کو عمل میں لانے کا نام تعلیم ہے اور زیور اخلاقیات سے آراستہ ہونے کا نام تربیت ہے۔

☆ اقبال: تعلیم کے تمام عناصر میں اصل روح "تربیت" کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تعلیم و تربیت کے باہم امتزاج سے ہی متوازن اور صحت مند نظام تعلیم تشکیل پاتا ہے (۴۵)۔

مسلمانوں کے نظام حیات میں علم اور تربیت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور یہ بھی نبی کریم ﷺ کے تتبع میں تھا کہ آپ ﷺ جہاں کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ادا فرماتے تھے وہاں تزکیہ نفس کی تربیت بھی فرماتے تھے (۴۶)۔

تعلیم معاشرتی زندگی کی مسلسل تجدید کا نام ہے اور تربیت کے ذریعے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ دراصل تعلیم و تربیت اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعے طلبہ کو ایک مخصوص قسم کی معاشرتی زندگی کی لذت سے آشنا کر کے انہیں زندگی کا سرگرم محافظ بنایا جاتا ہے۔ یا یوں کہ لیجیے کہ تعلیم و تربیت ایک طرف تو قوم کی صدیوں کی ذہنی اور روحانی کمائی کو آئندہ نسل کی طرف منتقل کر کے اسے تباہی سے بچاتی ہے اور دوسری طرف اس نسل میں یہ قابلیت اور صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ بزرگوں کے عطا کردہ ثقافتی ذخیرہ میں خود اپنی جدوجہد سے خاطر خواہ اضافہ کرے۔ اس کے برعکس جو لوگ محض لکھنے پڑھنے اور گننے اور گردن جھکائے پھرنے کی مہارتیں حاصل کرنے کو تعلیم و تربیت سمجھتے ہیں وہ غلط ہیں (۴۷)۔

فلاح انسانیت کے لیے تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ضروری

تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلانا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے اور ہمت کا نسخہ بجز اہل ہمت کی صحبت اور اطاعت کے اور کچھ نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے مکی اور مدنی ادوار میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا اہتمام فرمایا۔ تعلیمی مراکز بلاشبہ تربیت گاہیں تھیں۔ ایک دفعہ جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا تو وہ پھر اس کمال تربیت کے نتیجے میں عزم و

ہمت اور ثبات واستقامت کا پہاڑ بن جاتا۔اسی لیے تربیت کرتے وقت آپ ﷺ سہولت اور نرمی کو پیش نظر رکھتے(۴۸)۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۴۹)۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، سو آپ ان سے در گزر کریں اور ان کے لیے استغفار کریں۔

نبی ﷺ نے تربیت کے حوالے سے نرمی اور سہولت وخوش دلی کی تاکید فرمائی۔

ارشاد نبوی ہے:((يسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا)) (۵۰)

ترجمہ: آپ نے فرمایا، آسانی کرو اور سختی نہ کرو اور خوشخبری دو اور نفرت نہ دلاؤ۔

نبی ﷺ کو جب بھی دو کاموں میں اختیار ہوتا تو آپ ﷺ ہمیشہ آسان کام کو ختیار فرماتے۔جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:((ما خير بين أمرين إلا أخذ أيسرهما ما لم يكن إثما)) (۵۱)

ترجمہ: آپ ﷺ کو دو کاموں کے مابین جب بھی اختیار دیا گیا آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے جو سب سے آسان تھا اسے اختیار کیا جب تک وہ گناہ والا کام نہ ہو۔

اسلام کے نظام تربیت کا مقصد صالح انسان تیار کرنا ہے وہ انسان جو مکمل انسان ہو، جس میں انسانیت کے سارے پنہاں جواہر نمایاں ہو گئے ہوں۔

تزکیہ نفس: تعمیر سیرت اور تربیت کے لیے قرآنی اصطلاح تزکیہ نفس کی ہے۔تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، ابھارنا، نشوونما دینا(۵۲) وسیع معنی میں اس کا مطلب زندگی سنوارنا ہے اور زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے (۵۳)۔زندگی سنوارنے میں اصل اساس انسان کے اپنے نفس کی کیفیت ہے۔نفس انسانی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہئیے کہ انسانی وجود کی تین حیثیتیں ہیں۔ایک اس کا اخلاقی وجود ہے، دوسرا اس کا عقلی وجود ہے اور تیسرا اس کا حیوانی وجود ہے۔

نفس انسانی کا ایسا تزکیہ، تعلیم کا مقصد قرار پائے گا جو انسان کو اس دنیا میں اس کی اصل حقیقت سے اس طور پر آگاہ کرئے کہ وہ خالق سے بغاوت نہ کرئے بلکہ اس کی ہدایت کا دلجمعی سے اتباع کرئے۔ حیوانی وجود کی حیثیت سے وہ خواہشات ضرور پوری کرئے لیکن تعدیل کے ساتھ ان حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے جو خالق کائنات نے عائد کی ہیں (۵۴)۔

نبی اکرام ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوع انسانی کے معلم اور مربی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آپ ﷺ کے اس منصب کو بار بار واضح کر کے بیان کیا گیا ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفس، یعنی تربیت، آپ ﷺ کی بعثت کے مقاصد اولین میں ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (۵۵)۔

ترجمہ: وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

شریعت میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی بڑا زور دیا گیا ہے۔ فرائض نبوت میں جہاں کتاب و حکمت کی تعلیم ہے وہاں نفوس کا تزکیہ و تصفیہ بھی شامل ہے۔ اخلاق اور اوصاف حسنہ سے عاری صاحب علم اس چوپائے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس پر کتابوں کا ڈھیر لاد دیا جائے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی نہایت ضروری ہے۔ تربیت ہی انسان کو عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور شرافت و اخلاق کا لباس فاخرہ عطا کرتی ہے۔ اسی طرح جس علم سے انسان، انسان نہ بنے تو ایسی تعلیم سے جہالت ہی بھلی ہے (۵۶)۔ اسی لیے تزکیہ کو آپ ﷺ کا جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا، کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح نظری و علمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیر تربیت اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے (۵۷)۔

نبی ﷺ نے تزکیہ نفس کو اپنے انداز تربیت میں بڑی اہمیت دی ہے اور اس پر خصوصی توجہ فرمائی ہے کیونکہ انسانی نفس کا تربیتی امور میں بہت بڑی طاقت اور وجودی حقائق سے گہرا تعلق ہے (۵۸)۔ لہذا نفس

انسانی کا ایسا تزکیہ تعلیم کا مقصد قرار پائے گا جو انسان کو اس دنیا میں اس کی اصل حقیقت سے اس طور پر آگاہ کرئے کہ وہ خالق سے بغاوت نہ کرئے بلکہ اس کی ہدایت کا دل جمعی سے اتباع کرئے (۵۹)۔

تربیتی اصول

تعلیم سے زیادہ دشوار اور پیچیدہ مسئلہ تربیت کا ہے۔ فاسد اخلاق اور بری عادات سے پاک کر کے اچھی سیرت اور اخلاق کو نشو و نما دینا انتہائی صبر و تحمل، خداداد حکمت و دانائی اور غیر معمولی فہم و فراست کا طلب گار ہے۔ آنحضور ﷺ نے تربیت کے اس نازک کام کو جس طرح انجام دیا ہے اس کی نظیر سے دنیا خالی ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت سے خوشہ چینی کرتے ہوئے چند اصول یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

☆ قول و عمل کی یکسانی : مربی کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ قول و عمل کے تضاد سے پاک ہو اور خود اس کی سیرت بے داغ ہو۔ آنحضور ﷺ نے اس تقاضے کو اس طرح پورا کیا کہ آپ ﷺ نے ہر معاملے میں ہمیشہ راہ عزیمت اختیار کی۔

قول کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے معلم کو چاہئیے کہ جو حکم شاگردوں کو دے وہ خود بھی کرئے اور جس بات سے روکے اس سے خود بھی دور رہے اور معلم اپنی بیان کردہ بات یا مسئلہ کو طلبہ کے روبرو عملی طور پر کر کے دکھائے (۶۰)۔

☆ تربیت میں نفسیات کا لحاظ: مربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصلاح و تربیت کے کام میں نفسیات کا پورا لحاظ رکھے اور بات کو ایسے انداز اور ایسے موقع پر کہے کہ وہ سامع کے دل میں اترتی چلی جائے۔ آنحضور ﷺ اس کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے (۶۱)۔ تربیت میں لوگوں کی صلاحیت و استعداد اور ان کے ذہنی رجحانات کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ محبت : جس کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری ادا کی جا رہی ہے اس کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے سختی اور مار پیٹ کسی طرح سے بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جب ایسے مومنوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے کوئی گناہ کر لیا ہو اور پھر اپنے عمل پر پشیمان ہو تو اس طرح آواز دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ (۶۲)۔

ترجمہ: اے انسان! تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے بہکایا۔

یہاں کریم کا لفظ استعمال کیا گیا اور جبار یا قھار کا لفظ نہیں استعمال کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں انسان کو محبت اور شفقت کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔

☆ اسوۂ حسنہ: بچوں کے ذہنوں پر اسوہ حسنہ کا بڑا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے، اس لیے کہ بچے عام طور پر اپنے ماں باپ کی تقلید کیا کرتے ہیں، یہاں تک کہ ماں باپ ان میں بڑے پختہ آثار پیدا کرتے ہیں۔

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ هَوِّدَانِهِ،أَوْيُنَصِّرَانِهِ،أَوْيُمَجِّسَانِهِ، كَمَثَلِ البَهِيمَةِ تُنْتَجُ البَهِيمَةَ هَلْ تَرَى فِيهَا جَدْعَاءَ)) (۶۳)۔

ترجمہ: فرمایا ہر بچہ اسلامی فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی، یا مجوسی بنا لیتے ہیں جس طرح جانور صحیح سالم عضو والا بچہ جنتا ہے، کیا تم اس میں سے کوئی عضو کٹا ہوا دیکھتے ہو۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے والدین کو ترغیب دی ہے کہ وہ بچوں کے معاملات میں صدق و سچائی کی صفت میں عمدہ نمونہ بن کر پیش ہوں، بچے اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور ان کے اخلاق و عادات کو دیکھتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اسی بناء پر والدین سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ حتی المقدور اپنے اخلاق و اعمال کو اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق بنائیں۔

☆ تشویق: تربیت میں بچوں کو اچھے کاموں کی طرف تشویق دلانی چاہیئے اور جب اچھا فعل انجام دیں تو ان کی تعریف اور تحسین ہونی چاہیئے یہ خود مزید اچھے کاموں کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی انسانوں کے اچھے کاموں کے بدلے میں جنت کی بشارت دیتا ہے اور اس طرح انسان مزید اچھے کاموں کی طرف آگے بڑھتا ہے۔

☆ اعتدال: انسان کو ہر چیز میں انصاف و عدالت سے کام لینا چاہیئے اور کسی بھی کام میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے اچھا مربی وہ ہے جو کہ تربیت کے دوران زیر تربیت افراد کو حد اعتدال سے آشنا کروائے اور حدود میں رہ کر ذمہ داری ادا کرنے کی عادت ڈالے۔

☆ تفکر اور تدبر: مربی کی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں میں صحیح تفکر اور تدبر کی عادت ڈالے اور ہر کام سے پہلے اس کام کے مثبت اور منفی اثرات پر غور کرنے کی مشق کروائے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں اس مشق سے پوری طرح فائدہ اٹھائے اور اپنی ذات کو نقصانات سے بچائے (۶۴)۔

آنحضرت ﷺ کا انداز تعلیم وتربیت

سرور دوعالم حضرت محمد ﷺ پوری انسانیت کے لیے ایک عظیم اور مثالی معلم بن کر تشریف لائے ایسے معلم جن کی تعلیم وتربیت نے صرف تیئس سال کی مختصر مدت میں نہ صرف پورے جزیرۃ عرب کی کایا پلٹ دی بلکہ پوری دنیا کے لیے رشد وہدایت کی وہ ابدی قندیلیں بھی روشن کر دیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کو عدل وانصاف، امن وسکون اور عافیت واطمینان کی راہ دکھاتی رہیں گی۔

آنحضرت ﷺ کے انداز تربیت کی تمام خصوصیات کا احاطہ کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن میں یہاں آپ ﷺ کے انداز تربیت کی صرف چند خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو اپنی محدود بصیرت اور مطالعے کی حد تک مجھے معلوم ہوئیں۔

☆ حکمت ودانائی: نبی کریم ﷺ دعوتی اور تربیتی طریقوں میں دانائی اور حکمت کو پیش نظر رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکالتے اور نہ کوئی ایسی روش اختیار فرماتے جس سے مخاطب کوئی غلط تاثر قبول کرلے نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی حکمت سے بھری ہوئی ہے۔ آپ ﷺ اس بات کا بھرپور خیال رکھتے کہ اگر کسی کی کوتاہی علم میں آجائے تو اس کو اس انداز سے ٹوکا جائے کہ اسے برا محسوس ہو یا اس کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ چنانچہ آپ ﷺ اس کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کرتے۔ انفرادی طور پر متنبہ کرنے کے بجائے کسی مجمع کو خطاب کرتے ہوئے آپ ﷺ اس کی کوتاہی کی طرف اشارہ فرمادیتے [۶۵]۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم بھی یہ دیا تھا کہ حکمت سے لوگوں کو اپنے رب کی طرف بلاؤ۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ [۶۶]۔

ترجمہ: اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے۔

دعوت وتربیت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی ایک خاص حکمت یہ بھی رہی ہے کہ زیادہ لمبی بات، اکتادینے والے وعظ سے گریز فرماتے۔ مختصر سے مختصر الفاظ میں اپنے مدعا کو بیان کرنے کی کوشش کرتے تاکہ سننے والے کے ذہن میں بات اچھی طرح بیٹھ جائے۔

حضرت جابر بن سمرہؓ آپ ﷺ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:((كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لاَ يُطِيلُ الْمَوْعِظَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ إِنَّمَا هُنَّ كَلِمَاتٌ يَسِيرَاتٌ)) [۶۷] ترجمہ: رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز لمبی نصیحت نہیں کرتے بلکہ تھوڑی باتیں کہتے تھے۔

☆ عملی مظاہرہ: حضور ﷺ کی دعوت، آپ ﷺ کا پیغام صرف آپ ﷺ کی زبان کی حد تک نہ تھا۔ بلکہ جو بھی زبان سے نکلتا اس پر عمل بھی ہوتا۔ آپ ﷺ کی زندگی عملی مظاہرے کی آئینہ دار تھی۔ آپ ﷺ کے قول و عمل کی یکسانیت وہ قوت محرکہ تھی جس نے صحابہ اکرامؓ کی زندگیوں میں عظیم انقلاب بپا کر دیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ رہنے والا ہر شخص بلکہ آپ ﷺ کی زندگی کی ایک جھلک دیکھنے والا بھی بے ساختہ پکار اٹھتا تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

نبی ﷺ جس کام کی بھی ترغیب دیتے اسے عملاً کر کے بھی دکھاتے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ خندق سے مٹی ڈھو رہے تھے یہاں تک کہ غبار نے آپ ﷺ کے شکم کی جلد ڈھانک دی تھی (۶۸)۔

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ ﷺ عہد نامہ سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا "اٹھو اور نحر (قربانی) کرو پھر حلق کرو۔ لیکن مسلمانوں میں سے ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوا۔ آپ ﷺ نے تین بار فرمایا جب بھی کوئی نہ کھڑا ہوا تو آپ ﷺ ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کی حالت بیان فرمائی۔ ام سلمہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول اگر آپ ﷺ یہ چاہتے ہیں تو تشریف لے جایئے کسی سے کوئی بات نہ کیجئے یہاں تک کہ آپ ﷺ خود قربانی کر لیں اور پھر حجام کو بلایئے اور خود حلق کروایئے۔ چنانچہ آپ ﷺ اٹھے کسی سے کلام نہ فرمایا اور نحر کیا پھر حجام کو بلا کر حلق کروایا "جب لوگوں نے دیکھا تو وہ بھی کھڑے ہو گئے، انہوں نے بھی نحر کیا اور ایک دوسرے کا حلق کیا اور غم کی شدت کے باعث ایک دوسرے کو زخمی کر دیا (۶۹)۔

☆ شفقت و رحمت:

آپ ﷺ کے انداز تربیت میں شفقت و رحمت بھی اہم ہے۔ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی رحمت و شفقت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾ (۷۰)۔

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۷۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔

جب ہم رسول اللہ ﷺ کے طریق تربیت پر غور کرتے ہیں تو احادیث سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ کے سلسلہ میں شفقت و رحمت فرماتے۔ آپ ﷺ نے واضح الفاظ میں فرمایا: "اپنے آپ کو اتنے ہی عمل کا مکلف بناؤ جس کی طاقت اور سکت تمہارے اندر موجود ہو اس لیے کہ اللہ نہیں اکتاتا مگر تم اکتا جاؤ گئے۔" (۷۲)۔

☆ نرمی: رسول اللہ ﷺ کے طریق تربیت پر جب غور کرتے ہیں تو احادیث سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تعلیم و تربیت میں شدت کی روش اختیار نہ فرماتے تھے اور نہ ہی دوسروں کو اس کی اجازت دیتے تھے۔ نبی ﷺ اس بات کا اہتمام فرماتے کہ اسلامی تعلیمات کو آسان تر بنا کر پیش کیا جائے تاکہ صحابہ کرامؓ نہایت خندہ پیشانی سے ان تعلیمات کو اپنا سکیں اور اپنی زندگی میں انہیں عملی جامہ پہنا سکیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ: وہ کہتے ہیں کہ ہم مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اچانک ایک بدوی شخص آیا اور وہ مسجد میں کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اکرامؓ اسے جھڑکنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دو پیشاب کرنے سے نہ روکو۔ صحابہ اکرامؓ بدوی کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ پیشاب کر لے۔ پھر رسول اللہ ﷺ بدوی شخص کو بلاتے ہیں رسول اللہ ﷺ بدوی سے فرماتے ہیں کہ مساجد پیشاب کرنے یا گندگی کے لیے نہیں بنائی جاتیں بلکہ یہ مساجد اللہ تعالیٰ کے ذکر، نماز اور قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بنائی جاتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ اکرامؓ سے کہا تمہیں آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور تمہیں مشکلات میں مبتلا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجا۔ اس پیشاب پر پانی کا ایک ڈول انڈیل دو۔ بدوی یہ بات سن کر کہنے لگا: الٰہی مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما ہمارے علاوہ کسی اور پر رحم نہ کر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ارے تو نے تو وسعت میں تنگی پیدا کر دی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی وسیع ہے" (۷۳)۔

☆ شگفتہ مزاجی: شگفتہ مزاجی کے بغیر انسان کی شخصیت غیر دلچسپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے مصنوعی رکھ رکھاؤ سے لوگوں کو نفرت ہونے لگتی ہے۔ نبی ﷺ نفسیات کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھتے

ہیں۔ اگر تاریخ آپ ﷺ جیسا رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی و متانت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے تو شگفتہ مزاجی، حسن ذوق، تبسم و مزاح میں بھی آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہیں۔

آپ ﷺ نے صحابہ اکرامؓ کی محفلوں کو اگر اپنے خطبوں سے گرمایا، اپنی تقریروں سے بزم کو رقت آمیز کر دیا، اپنی پُر سوز نصیحتوں سے آنسوؤں اور سسکیوں کا سماں باندھ دیا تو آپ ﷺ نے اپنی خوش مزاجی وخوش طبعی سے مجلسوں کو گلزار بنا دیا۔ اس طرح زندگی کے نشیب و فراز میں جینے کا سہارا بھی دیا اور مزاح کے ذریعہ کوئی نہ کوئی حقیقت بھی ذہن نشین فرما دی۔

مثلاً امام ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضور ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے صدقہ کا ایک اونٹ طلب کیا تاکہ اس پر سامان لاد کر گھر لے جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دیئے دیتا ہوں"۔ اس آدمی نے کہا کہ: "اے اللہ کے رسول ﷺ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا" آپ ﷺ نے فرمایا: "اونٹ بھی اونٹنی ہی کا بچہ ہوتا ہے" (۷۴)۔

اس مزاح کو لوگوں نے سنا ہوگا یقیناً وہ مسکرائے ہوں گے۔ مگر آنحضور ﷺ کا مقصد محض ہنسا ہنسانا نہیں تھا بلکہ اس آدمی کی ذہنی تربیت کرنا مقصود تھی۔ اس کے ذہن کو سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔

تعلیم و تربیت نسواں

عورتوں کی تعلیم و تربیت اس لیے بھی حد درجہ ضروری ہے کہ انہیں بچوں کی تربیت کرنا ہے۔ ماں کے لیے شرعی نقطہ نگاہ سے بھی بچوں کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا لازمی ہے اور اس سلسلے میں وہ جوابدہ ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَالمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ)) (۷۵)

ترجمہ: عورت اپنے خاوند کے گھر اور بچوں پر نگران ہے۔ قیامت کے دن اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

عام مشاہدہ یہی ہے کہ ماں اور گھریلو ماحول جتنا پاکیزہ ہوتا ہے۔ اکثر اولاد اتنی ہی صالح، متقی، فرمانبردار اور ملک و ملت کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ چھوٹے اور معصوم بچے نرم ٹہنی کے مانند ہوتے ہیں۔ انہیں جدھر موڑتے جائیں ادھر مڑتے جاتے ہیں۔

☆ امام غزالی: امام غزالی تعلیم و تربیت کے بارے میں کہتے ہیں:

"بچہ اپنے والدین کے ہاں بطور امانت ہوتا ہے۔ اس کا پاکیزہ قلب ہر قسم کے نقش اور صورت سے خالی نفیس جوہر ہوتا ہے۔ اس پاکیزہ قلب پر جو کچھ نقش کر دیا جائے وہ اسے قبول کرنے کو تیار ہوتا ہے اور جس طرف اسے مائل کریں ادھر مائل ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھلائی کی عادات اور اچھے اخلاق و اطوار کا عادی بنایا جائے تو اس میں اچھے اخلاق و اطوار راسخ ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ دنیا و آخرت میں سعادت مند قرار پاتا ہے اور اگر اسے بری عادات اور اخلاق ذمیمہ کا عادی بنایا جائے تو وہ انہی چیزوں کا خوگر ہو جاتا ہے نتیجتاً دنیا و آخرت میں ہلاک ہوتا ہے" (۷۶)۔

غفلت کے نتائج تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت نہ صرف افراد اور کنبوں بلکہ ملک و ملت سب کے حق میں انتہائی خطرناک اور مضر ثابت ہوتی ہے کیونکہ:

☆ بچے ناکارہ اور نکمے رہ جاتے ہیں، ان کی پیدائشی قوتیں اور صلاحیتیں یا تو ٹھٹھر جاتی ہیں یا غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں۔

☆ طرح طرح کی برائیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو کر بچے دین دنیا دونوں تباہ کر لیتے ہیں۔

☆ آنکھوں کی ٹھنڈک اور بڑھاپے کی لکڑی بننا تو الگ رہا، الٹا خار بن کر کھٹکتے اور والدین پر بوجھ بن کر رہتے ہیں۔

☆ باپ دادا کی کمائی نہایت بے دردی سے اڑا دیتے ہیں۔

☆ اپنے خراب کردار سے دین و ملت کو بدنام کرتے ہیں۔

☆ جرائم پیشہ ہو کر سب کے لیے دردِ سر بنتے ہیں اور ملک و معاشرے کو طرح طرح سے نقصان پہنچاتے ہیں۔

☆ ملک و قوم صالح افراد، معاشرہ بے لوث خادموں اور اچھے شہریوں سے مہروم رہ جاتے ہیں۔

☆ ملکی معاش اور اجتماعی اخلاق کے لیے وہ گھن ثابت ہوتے ہیں۔ غرض جنت کے وہ پھول جو خوشبو پھیلانے کے لیے کھلے تھے اور ابتداء میں ہر ایک کی فرحت و انبساط کا سامان تھے۔ غفلتوں اور کوتاہیوں کے نتیجے میں غلاظت کا ڈھیر بن جاتے اور اپنے ناقابل برداشت تعفن سے سب کا ناک میں دم کر دیتے ہیں اور اسی طرح کوتاہی اور لاپروائی کا قدرت ہر ایک سے انتقام لیتی ہے (۷۷)۔

تربیت اولاد سے بے اعتنائی

☆ یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ تربیت کے لحاظ سے ہمارے گھر یکساں طرز عمل پر کاربند نہیں ہیں بلکہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہیں بے پناہ سختی اور کہیں بہت زیادہ نرمی، اعتدال اور میانہ روی کی راہ سے بہت سے گھرانے نا آشنا ہیں۔ بعض گھرانوں میں بچے کی نشو و نما بزدلی، خوف اپنی ذات پر بے اعتمادی اور ذہنی انتشار کے ساتھ ہوتی ہے۔

☆ ایسے گھرانے بھی ہیں جہاں بچے لاڈ پیار کے اتنے رسیا ہوتے ہیں کہ کسی قاعدے، ضابطے کی پابندی ان کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ان کی اصل فطرت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔

☆ ایسے گھرانے بھی ہیں جہاں بچے کی نشو و نما جہالت اور بد تمیزی اور اعلیٰ درجے کے اخلاق و آداب سے محروم ماحول میں ہوتی ہے۔ یہ بچے نہ تو آداب اور سلیقے سے باخبر ہوتے ہیں اور نہ صفائی اور گندگی کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں۔

☆ کچھ گھرانوں میں بچوں کا مزاج خود پسندی اور کبر و نخوت کا حامل ہوتا ہے، ایسے بچے اپنے عیش و نشاط میں مگن نظر آتے ہیں۔ انہیں معاشرے کے غم اور خوشی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

☆ بعض گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں بچہ دینی ماحول میں پروان چڑھتا ہے لیکن یہ اس کی دین داری بے بنیاد عقائد اور خرافات سے بھرپور ہوتی ہے۔ بعض گھرانے ایسے بھی ہیں جن کے بچے دین سے بالکل دامن چھڑا لیتے ہیں (۷۸)۔

☆ بعض والدین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی نازک مزاجی کا احساس کیے بغیر انہیں کوسنا شروع کر دیتے ہیں اس سے بچوں میں احساس کمتری اور احساس ناکامی پیدا ہوتا ہے (۷۹)۔

خلاصۂ بحث

غار حرا میں جب نور کی پہلی کرن داخل ہوئی تو اقراء کا پیغام لے کر آئی تعلیم اور قلم کا احسان یاد دلایا اور دونوں کا رشتہ خالق کے ذکر سے جوڑا۔ اسلام میں تعلیم و تربیت کا جو مقام ہے اس کے لیے اس سے بڑی کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ نبی ﷺ کے کار نبوت میں سب سے اہم فرائض تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس قرار دیئے گئے اور آپ ﷺ نے اس بات پر فخر کا اظہار فرمایا کہ آپ ﷺ معلم بنا کر بھیجے گئے۔ یہ تعلیم کا عمل ہی تھا کہ جس کے ذریعے حضور ﷺ نے وہ امت تیار کی جس نے آپ ﷺ کے بعد دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کے چراغ روشن کر دیئے۔ یہ آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ہی فیض تھا جس نے انسانیت کا پلڑا موت سے زندگی کی طرف جھکا دیا۔

اسلامی تصورات میں حصول علم، تربیت سے علیحدہ نہیں۔ دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ علم ایمان کی بنیاد ہے اور ایمان تربیت کی اساس۔ یہ بھی دور جدید کا ایک تحفہ ہے کہ علم سے سیرت و کردار کا تعلق توڑ دیا گیا ہے۔ علم مجرد اور محض علم ہوتا ہے جس کا ذاتی زندگی اور سیرت و کردار سے تعلق ضروری نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس طرح کے نظام تعلیم سے ایک تعلیم یافتہ بے کردار نسل تیار ہوئی ہے۔ بد قسمتی سے مسلم ممالک میں بھی عملی صورت حال یہی ہے۔ بے خدا تہذیب کے غلبہ اور دور غلامی کے اثرات کے تحت ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کرتے کہ نظام تعلیم کی جس طرح یہ ذمہ داری ہے کہ افراد کو علم و ہنر سکھائے اسی طرح یہ ذمہ داری بھی ہے کہ ان کے سیرت و کردار کو اسلام کے مطلوبہ سانچہ میں ڈھالے۔

دنیا بھر میں یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ علم کے حصول کے لیے یہ کافی نہیں کہ محض کتابیں پڑھ لی جائیں بلکہ ضروری ہے کہ عملی تربیت بھی دی جائے۔ مغربی ممالک میں کتابی علم سے زیادہ عملی تربیت پر توجہ دی جاتی ہے لیکن ہمارے اسلامی ممالک میں عملی تربیت کا فقدان ہے اور کتابی علم کو ہی کافی سمجھا گیا ہے دوسری طرف دینی اور اخلاقی علوم کے بارے میں یہ کافی ہے کہ ایک مختصر سی کتاب شامل نصاب کر دی جائے۔ رہی عملی تربیت تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

نظام تعلیم میں پائے جانے والے اس بنیادی نقص کے نتائج بڑھتے ہوئے جرائم کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہیں۔ قتل، اغوا، ڈکیتی اور دیگر اخلاقی جرائم میں ملوث افراد کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے۔ وہ لوگ جن سے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ زندگی کے حسن میں اضافہ کریں گے، وہ فساد فی الارض کے

مرتکب ہو رہے ہیں۔ اب معاشرے کی بگڑتی ہوئی اخلاقی صورت حال کا تقاضا ہے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا ایک نظام بھی ترتیب دیا جائے تاکہ ہمارے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد جہاں ماہر ڈاکٹر اور انجنیئر ہوں، وہاں اچھے مسلمان اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے مزین شہری بھی ہوں۔

اسلامی تعلیم و تربیت کا ہدف بھی یہ ہے کہ "مکمل شخصیت کا مومن" بنایا جائے جو زندگی پر مثبت نظر رکھتا ہو۔ ایسا مؤمن جو قوی ہمت، پختہ عزم کا مالک ہو، دھوکا اور پست ہمتی لاحق نہ ہو سکے۔ اسے اگر تن آسانی ملے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اس کے راستے سے جڑا رہے اور تنگی ملے تو اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرے اور ناپسندیدہ امور پر صبر کرے اور پامردی و استقلال سے سامنے آنے والی مشکلات و مصائب کا سامنا کرے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی امیدوں تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمادے۔ (آمین)

علامہ اقبال کہتے ہیں:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ (۸۰)

حواشی و حوالہ جات

۱) سورۃ آل عمران: ۱۱۰

۲) ڈاکٹر مشتاق رحمان صدیقی، تعلیم و تدریس، پاکستان ایجوکیشن فاونڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۸، ص:۱۹

۳) سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل، لاہور، ص:۶۱۲

۴) مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۴، ص، ۳۶۲

۵) راغب اصفہانی، المفردات، ترجمہ و حواشی، محمد عبدہ، المکتبہ القاسمیہ لاہور، ص:۶۳۵

۶) اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، ص:۴۵۱

۷) عبدالرحمان خان، اسلام کا نظام تعلیم، عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ، ملتان، ۱۹۸۳، ص:۲۱

۸) ڈاکٹر مشتاق الرحمان صدیقی، شمس الاسلام، اسلامی حکمت تعلیم، بھیرہ، اپریل ۱۹۸۰، ص:۲۰

۹) تعلیم و تدریس، ص:۲۱

۱۰) بنت الاسلام، علم، ادارہ بتول، لاہور، ۱۹۸۰، ص:۴

۱۱) تعلیم و تدریس، ص:۲۱

۱۲) قاضی فضل واحد، تعلیم و تربیت قرآن و حدیث کی روشنی میں، پاکستان اکیڈیمی برائے دیہی ترقی، پشاور، اگست، ۱۹۹۵، ص:۷۲

۱۳) ایضاً، ص:۷۰

۱۴) پروفیسر فائزہ احسان صدیقی، تعلیم الفائزون، رب پبلشرز، کراچی، مارچ، ۲۰۰۷، ص:۶۵

۱۵) تعلیم و تربیت قرآن و حدیث کی روشنی میں، ص:۷۱

۱۶) ایضاً، ص:۶۶

۱۷) محمد اکرام قریشی، فلسفہ و تاریخ تعلیم، مجید بک ڈپو، لاہور، ص:۷۰

۱۸) افضل حسین، فن تعلیم و تربیت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، اپریل، ۲۰۰۸، ص:۱۵۰

۱۹) ڈاکٹر خالد علوی، فکر و نظر، تعلیم اور جدید تہذیبی چیلنج، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، اپریل۔جون، ۲۰۰۴، شمارہ:۴، ص:۳۵

۲۰) مسلم سجاد، اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد، ۱۹۹۲، ص:۳۸

۲۱) ڈاکٹر جارج کرشین، نظریہ تعلیم، مترجم، ڈاکٹر قاضی عبدالحمید، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۴۲، ص:۳۰

۲۲) سورۃ آل عمران: ۱۱۰

۲۳) تعلیم الفائزون، ص:۶۸

۲۴) المفردات، ص:۳۳۳

۲۵) عبد الحفیظ، مصباح اللغات، خزینۂ علم و ادب لاہور، ص:۲۵۸

۲۶) فرہنگ آصفیہ، جلد:۱، ص:۶۰۰

۲۷) نور الحسن نیر، نور اللغات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۱/ ۹۵۰

۲۸) شبیر حسن میثمی، اسلامی تربیت، زہراء آکادمی، ۱۹۹۸ء، ص:۹

۲۹) مفتی ثناءاللہ محمود، رسول اکرم کا انداز تربیت، دارالاشاعت کراچی، ستمبر، ۲۰۰۵ء، ص:۲۹

۳۰) ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد، تربیت اساتذہ، پاکستان ایجوکیشن فاونڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص:۱۱۹

۳۱) رئیس احمد جعفری، فلسفہ تعلیم و تربیت، کتاب منزل لاہور، جولائی، ۱۹۵۳ء، ص:۱۷

۳۲) عبد الحمید الصید، أسس التربیۃ الاسلامیہ فی السنۃ النبویۃ، مطبوعہ الدار العربیہ للکتاب، لیبیا، ص:۲۵

۳۳) تعلیم الفائزون، ص:۹۵

۳۴) سورۃ الرعد: ۲۸

۳۵) ڈاکٹر محمد رفیع الدین، اسلام کا نظریہ تعلیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۲۸

۳۶) سورۃ الذریت: ۵۸

۳۷) سورۃ التحریم: ۶

۳۸) ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۶/ ۲۹

۳۹) اسلامی تربیت، ص:۱۱

۴۰) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، ص:۳۸

۴۱) سورۃ الشمس: ۸

۴۲) پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کی حکمت عملی، متین الرحمان مرتضیٰ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص:۸۱-۸۲

۴۳) التربیۃ فی الإسلام، مقدمہ، عیسی البابی، مصر، ۱۹۵۵ء

۴۴) علامۃ محمد عبد الرؤف، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت،، ۱۹۹۴ء، ص:۱/ ۲۱۹

۴۵) تعلیم و تدریس، ص:۲۹۱

۴۶) اسلام کا نظام تعلیم، ص:۲۱

۴۷) ڈاکٹر محمد اکرام، تعلیم و تربیت اور والدین، بک وائز، لاہور، ۱۹۸۸، ص:۳۵-۳۶

۴۸) تعلیم و تربیت قرآن و حدیث کی روشنی میں، ص:۴۱

۴۹) سورۃ آل عمران: ۱۵۹

۵۰) صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب العلم، باب ماکان النبی ﷺ یتخولھم بالموعظۃ والعلم.....، حدیث: ۶۹

۵۱) ایضاً، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی ﷺ، حدیث: ۳۳۷۶

۵۲) تفہیم القرآن، ص:۶/۳۵۴

۵۳) ایضاً، ص:۱/۱۱۲

۵۴) اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال، فاونڈیشن فار ایجوکیشنل ڈولپ منیٹ، نئی دہلی، ص:۶۰

۵۵) سورۃ الجمعۃ: ۲

۵۶) حافظ محمد سعد اللہ، منہاج "عورت کی تعلیم و تربیت، لاہور، اکتوبر، ۱۹۸۴، شمارہ:۴، ص:۲/۱۵۳

۵۷) تعلیم و تربیت قرآن و حدیث کی روشنی میں، ص:۴۰

۵۸) محمد قطب ابراہیم، منہج التربیۃ الاسلامیۃ، مطبوعہ دار الشروق، جلد:۱، ص:۴۱

۵۹) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، ص:۳۹

۶۰) ڈاکٹر فضل الٰہی، نبی کریم بحثیت معلم، مکتبہ قدوسیہ لاہور، ص:۱۹۴

۶۱) سید وصی مظہر ندوی، تعلیم و تربیت کے اصول، صدیقی ٹرسٹ، کراچی، ص:۱۱

۶۲) سورۃ الانفطار: ۶

۶۳) صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین، حدیث: ۱۳۱۹

۶۴) اسلامی تربیت، ص:۱۷-۱۹

۶۵) سراج الدین، رسول خدا کا طریق تربیت، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ستمبر، ۲۰۰۸، ص:۱۳

۶۶) سورۃ النحل:۱۲۵

۶۷) امام ابوداؤد، سنن ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، ص:۱/۴۱۸

۶۸) صحیح بخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب الرجز فی الحرب ورفع الصوت.....، حدیث: ۲۸۷۰

۶۹) ابن قیم، زاد المعاد، مترجم، رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی کراچی، اگست ۱۹۶۲ء، ص:۲/۲۲۱

۷۰) سورۃ الانبیاء: ۱۰۷

۷۱) سورۃ آل عمران: ۱۵۹

۷۲) بخاری، کتاب الصوم، باب صوم شعبان، حدیث: ۱۸۶۹
۷۳) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب وجوب غسل البول وغیرہ، حدیث:۷۸۶
۷۴) سنن ترمذی، امام ترمذی، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۹۹۸، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی المزاح، ص:۳/ ۲۵۴، حدیث: ۱۹۹۱
۷۵) صحیح بخاری، کتاب العتق، باب کراھیۃ التطاول علی الرقیق، حدیث: ۲۴۱۶
۷۶) امام غزالی، احیاء العلوم، مکتبہ رحمانیہ، ص:۳/ ۹۲
۷۷) فن تعلیم و تربیت، ص: ۳۳
۷۸) اسلام کا نظام تعلیم، ص:۱۲۹
۷۹) مولانا بدر القادری، اسلام اور تربیت اولاد، ادارہ معارف نعمانیۃ لاہور، مئی ۱۹۹۳، ص:۳۴
۸۰) علامہ اقبال، کلیات اقبال، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ص:۳۱۰

****

حق المرأة في إدارة أملاكها التجارية في الإسلام

Women's Right of Entrepreneurship (in the light of Islam)

الدكتورأحمد بن يوسف الدريويش *

ABSTRACT

Islam has given the dignity to women more than as it is given by any other religious or social system. This dignity covers almost every fiedld of life. Business is also one of these fields, where Islam has provided a variety of oppurtunities. Basic sources of Islam, that are, Quran and Hadith elaborated all these rights of women.

The right of being a business-woman as provided by Islam is based on the one of the basic principals of Islam, that is, equality of oppurtunities without taking into consideration the gender of a member of the society. A woman can exercise all these rights as a man can.

Women are the other half of the society and without which life cannot be imiginated on its peak. It is imperitive to mention here that women are playing a pivotal role in the development of any country/society and it is impossible to achive advancement without the participation of women.

In this article, different kinds of rights that are given to women in an Islamic system such as policital, financial, health, educational, social and family rights, are being dicussed in detail. An exculsive foxus remained on business related rights of a woman.

Keywords: Entrepreneurship, dignity, rights of women, society, business.

* رئيس الجامعة الإسلامية العالمية ،إسلام آباد،باكستان

الحمد لله رب العلمين، وصلى الله وسلم على نبينا محمد وآله وصحبه أجمعين، أما بعد: فيقول الله تعالى:﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ ءَادَمَ﴾[1] ،ويقول النبي ﷺ:((اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا))[2]، ويقول عليه الصلاة والسلام:((النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ))[3].

المرأة في الإسلام ذات مكانة عالية مرموقة، وهي الحصن الذي يحمى المجتمع من الانهيار المعنوي والمادي، فالأم في بيتها هي المدرسة الأولى للجيل الذي يستطيع في مستقبله توجيه دفّة الحياة إلى درجات الرقي والتقدم.. فالدين قائم على عدم التمييز في الكرامة وفي الحقوق الأساسية ما بين إنسان وآخر لا في العرْق ولا في الجنس ولا في النسب ولا في المال.

فقد جاءت هذه الشريعة شريعة الإسلام خاتمة الشرائع المنزلة من عند الله بما فيه صلاح أمر العباد في المعاش والمعاد ومن ذلك: الدعوة إلى كل فضيلةوالنهي عن كل رذيلة، وصيانة المرأة وحفظ حقوقها خلافاً لأهل الجاهلية قديماً وحديثاً الذين يظلمون المرأة ويسلبون حقوقها جهاراً أو بطرق ماكرة..

لقد أحاط الإسلام المرأة بسياج من الرعاية والعناية، وارتفع بها وقدّرها، وخصها بالتكريم وحُسْن المعاملة ابنةً وزوجةً وأختًا وأُمًّا، فقرر الإسلام أولاً أنَّ المرأة والرجل خُلِقَا من أصل واحد؛ ولهذا فالنساء والرجال في الإنسانيَّة سَوَاء، قال تعالى: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ﴾[4]. وهناك آيات أخرى كثيرة تُبَيِّن قضاء الإسلام على مبدأ التفرقة بين الرجل والمرأة في القيمة الإنسانية المشتركة..

وانطلاقًا من هذه المبادئ، وإنكارًا لعادات الجاهلية والأمم السابقة فيما يخص وضع المرأة، جاء الإسلام يدافع عن المرأة ويُنزلها المكانة التي لم تبلغها في ملَّة ماضية، ولم تُدْرِكْها في أُمَّة تالية؛ حيث شرع لها –كأمٍّ وأخت وزوجة وابنة– من

الحقوق منذ أربعةَ عَشَرَ قرنًا.. فقرر الإسلام بدايةً أن النساء يُماثِلن الرجال في القَدْر والمكانة، ولا ينتقص منهن أبدًا كونهن نساء، وفي ذلك قول الرسول ﷺ يؤصل لقاعدة مهمة: "إِنَّ النسَاءَ شقائق الرجال"(٥).كما ثبت عنه ﷺ أنه كان دائم الوصية بالنساء، وكان يقول لأصحابه: ((اسْتَوْصُوا بالنساء خَيْرًا)) (٦). وتكررت منه هذه النصيحة في حجة الوداع وهو يخاطب الآلاف من أُمته..

ورغبة مني في الإسهام في بيان حقوق المرأة في الإسلام عامة وبيان حقوقها في إدارة أملاكها التجارية خاصة،لإفادة نفسي أولاً، ثم إخواني ممن يطلعون عليه، فإنني اخترت الكتابة في موضوع أنني أعتقد أهميته، ألا وهو حق المرأة في إدارة أملاكها التجارية.

وهذا هو المنهج الذي طبق في المملكة العربية السعودية فإن المرأة في المملكة قد نالت جميع حقوقها المشروعة وفق أحكام الشريعة، وبما يناسب وطبيعتها الخُلقية والخلقية؛ حيث أصبحت تشارك في الحياة السياسية كمجلس الشورى وغيره من الأعمال التي تمس حاجات المرأة السعودية وفق آلية محددة وبما لا يتعارض مع مبادئ الإسلام وأحكامه وضوابطه والتقاليد والأعراف الأصيلة للمجتمع..

ولا شك في أهمية هذا الموضوع لا سيما في هذا الوقت الذي نحتاج فيه إلى إبراز وجهة نظر الإسلام الحقيقية تجاه المرأة ومنحها حقوقها كاملة والرد على من يحاول أن يثير بعض الشبه تجاه هذه الحقوق التي منحها إياه الإسلام قبل أكثر من أربعة عشر قرن من الزمن ابتداء من أزواج النبي ﷺ مروراً بالصحابيات الجليلات ثم نساء المسلمين عامة وإلى وقتنا هذا بل إلى أن تقوم الساعة ويرث الله الأرض ومَنْ عليها، فوجهة نظر الإسلام حيال حقوق المرأة لا تتغير ولا تتبدل بتغير الأزمنة والأمكنة ولا باختلاف الرؤى والأفكار أو محاولات الأعداء النيل من هذه الحقوق

التي شرعها الله ورسوله ﷺ وأجمعت عليها الأمة وتوارثها الخلف عن السلف..هذا وقد انتظمت خطة هذا البحث كالآتي:

المقدمة، وفيها: الافتتاحية.

المبحث الأول: حق المرأة في إدارة أملاكها التجارية

وتحته ثلاثة مطالب:

المطلب الأول: تكريم الإسلام للمرأة

المطلب الثاني: مساواة المرأة بالرجل في الحقوق

ويشمل النقاط التالية:

١- مبدأ المساواة في الإسلام بين الرجل والمرأة

٢- بين المساواة والاختلاف

٣- من أمثلة الحقوق التي ساوى الإسلام فيها بين المرأة والرجل

المطلب الثالث: حق المرأة في التملك من خلال تقريرات الفقهاء رحمهم الله

المطلب الأول: تكريم الإسلام للمرأة

لقدكرم الإسلام المرأة تكريما عظيما، كرمها باعتبارها (أُمّاً) يجب برها وطاعتها والإحسان إليها، وجعل رضاها من رضا الله تعالى، وأخبر أن الجنة عند قدميها، أي أن أقرب طريق إلى الجنة يكون عن طريقها، وحرم عقوقها وإغضابها ولو بمجرد التأفف، وجعل حقها أعظم من حق الوالد، وأكد العناية بها في حال كبرها وضعفها، فلها الإحسان والتوقير والطاعة، والصحبة والبر، فإذا كبرت في السن كان البر والإحسان أعظم وألزم، مع عدم التضجر من خدمتها، أو استثقال طلباتها، وكل ذلك في نصوص عديدة من القرآن والسنة..

ومن ذلك: قوله تعالى: ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا﴾ [٧]، وقوله عز وجل: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾ [٨].

وعَنْ مُعَاوِيَةَ السُّلَمِيِّ رضي الله عنه قَالَ : أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي كُنْتُ أَرَدْتُ الْجِهَادَ مَعَكَ أَبْتَغِي بِذَلِكَ وَجْهَ اللَّهِ وَالدَّارَ الآخِرَةَ : قَالَ : وَيْحَكَ أَحَيَّةٌ أُمُّكَ ؟ قُلْتُ : نَعَمْ . قَالَ : ارْجِعْ فَبَرَّهَا . ثُمَّ أَتَيْتُهُ مِنْ الْجَانِبِ الآخَرِ فَقُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ، إِنِّي كُنْتُ أَرَدْتُ الْجِهَادَ مَعَكَ أَبْتَغِي بِذَلِكَ وَجْهَ اللَّهِ وَالدَّارَ الآخِرَةَ ، قَالَ : وَيْحَكَ ! أَحَيَّةٌ أُمُّكَ ؟ قُلْتُ: نَعَمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ. قَالَ : فَارْجِعْ إِلَيْهَا فَبَرَّهَا. ثُمَّ أَتَيْتُهُ مِنْ أَمَامِهِ فَقُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنِّي كُنْتُ أَرَدْتُ الْجِهَادَ مَعَكَ أَبْتَغِي بِذَلِكَ وَجْهَ اللَّهِ وَالدَّارَ الآخِرَةَ، قَالَ : وَيْحَكَ ! أَحَيَّةٌ أُمُّكَ ؟ قُلْتُ : نَعَمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ. قَالَ: وَيْحَكَ الْزَمْ رِجْلَهَا فَثَمَّ الْجَنَّةُ) [٩]. وهو عند النسائي بلفظ: (فَالْزَمْهَا فَإِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا) [١٠].

وروى الإمامان البخاري ومسلم عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: (جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ، مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي ؟ قَالَ : أُمُّكَ . قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ : ثُمَّ أُمُّكَ . قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ : ثُمَّ أُمُّكَ قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ : ثُمَّ أَبُوكَ) [١١].

وكرم الإسلام المرأة زوجةً، فأوصى بها الأزواج خيرا، وأمر بالإحسان في عشرتها، وأخبر أن لها من الحق مثل ما للزوج إلا أنه يزيد عليها درجة، لمسئوليته في الإنفاق والقيام على شئون الأسرة، وبين أن خير المسلمين أفضلُهم تعاملا مع زوجته، وحرم أخذ مالها بغير رضاها، ومن ذلك قوله تعالى: ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾[١٢]، وقوله ﷺ:(اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا) [١٣] وقوله ﷺ: (خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لأَهْلِي)[١٤] فجعل النبي ﷺ مقياس خيرية الإنسان هو

طريقته وتعامله مع زوجته، وهذا أمر بإحسان معاملة الزوجة وإكرامها أكثر من غيرها، وهذه هي علامة صلاح الإنسان وفضله..

وكرمها بنتا، فحث على تربيتها وتعليمها، وجعل لتربية البنات أجرا عظيماً، ومن ذلك: قوله ﷺ: ((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتَّى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ)) (١٥). فهذه وصية عظيمة بالإحسان إلى البنات، وأن جزاء من أحسن إليهن الخير من الله تعالى والجنة والنعيم..

وكرم الإسلام المرأة أختا وعمة وخالة، فأمر بصلة الرحم، وحث على ذلك، وحرم قطيعتها في نصوص كثيرة، منها: قوله ﷺ: ((يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَفْشُوا السَّلامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلامٍ)) (١٦). وروى البخاري عَنْ النَّبِيِّ ﷺ أنه قَالَ: قال اللَّهُ تعالى للرحم: ((مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ،وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ)) (١٧).

وكل من للمسلم قرابة بهن هو مأمور على العموم بالإحسان إليهن بالزيارة، والسؤال عن أحوالهن، والإهداء إليهن، وعمل المعروف والبر..

وبالجملة؛ فالإسلام رفع من شأن المرأة، وسوى بينها وبين الرجل في أكثر الأحكام، فهي مأمورة مثله بالإيمان والطاعة، ومساوية له في جزاء الآخرة، ولها حق التعبير، تنصح وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر وتدعو إلى الله، ولها حق التملك، تبيع وتشتري، وترث، وتتصدق وتهب، ولا يجوز لأحد أن يأخذ مالها بغير رضاها، ولها حق الحياة الكريمة، لا يُعتدى عليها، ولا تُظلم، ولها حق التعليم، بل يجب أن تتعلم ما تحتاجه في دينها..ومن قارن بين حقوق المرأة في الإسلام وما كانت عليه في الجاهلية أو في الحضارات الأخرى علم حقيقة ما قلناه، بل نجزم بأن المرأة لم تكرم تكريما أعظم مما كرمت به في الإسلام..

المطلب الثاني:مساواة المرأة بالرجل في الحقوق

ويشمل النقاط التالية:

١– مبدأ المساواة في الإسلام بين الرجل والمرأة.

٢– بين المساواة والاختلاف.

٣– من أمثلة الحقوق التي ساوى الإسلام فيها بين المرأة والرجل.

أولاً: مبدأ المساواة في الإسلام بين الرجل والمرأة:

جاء الإسلام ليعلن للبشرية جمعاء في وضوح (إنما النساء شقائق الرجال) فالمرأة هي النصف الآخر في المجتمع والذي من دونه لا تتصور حياة له.. ولم يترك الإسلام المرأة تحت سلطان الرجل المطلق.. كما كان الحال في الجاهلية... بل رفع منزلتها وعمل على تحريرها من تلك السلطة المتطرفة التي كانت ترزح تحتها..كما إن الإسلام لم يورد حقوق المرأة بشكل عموميات غامضة.. وإنما فصل تلك الحقوق.. وبين الكثير من الواجبات التي رسمت صورة واضحة للمرأة كإنسان مشاركة للرجل في مجالات الحياة التي تتفق وطبيعتها.. والإسلام بذلك يكون قد قدم للبشرية فتحا مبينا.. وثروة عظيمة كانت قبله..

فالناس من حيث الكرامة الإنسانية سواسية في نظر الإسلام، وإنما يتفاضل الناس بحسب عملهم الصالح، وحسن خلقهم، وتقواهم، وإحقاق العدل ووضع الموازين القسط بالحق بين الناس، وحفظ حقوقهم، قال الرسول محمد ﷺ: "لا فضل لعربي على أعجمي ولا لعجمي على عربي ولا أحمر على أسود ولا أسود على أحمر إلا بالتقوى"[١٨]. وتنص المادة الثامنة من النظام الأساسي للحكم في المملكة العربية السعودية على: "أن الحكم في المملكة العربية السعودية يقوم على أساس العدل والشورى، والمساواة وفق الشريعة الإسلامية".

يقول الصحفي والسياسي الهندي كوفهيلالجايا: "إن مبدأ المساواة في الإسلام لا يوجد له مثيل".

ثانياً: بين المساواة والاختلاف

قال تعالى: ﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾[١٩]، أي في الخلقة والقوة، والخصائص، والإسلام في هذا الجانب يتبع الفطرة في تقسيم الوظائف والأنصبة، فالرجل رجل، والمرأة امرأة، ولكل خصائصُه، وهذا لا يعني عدم المساواة في الخلقة البشرية أو عدم التكريم من حيث أصل الخلق، أو عدم الحرية، ولكن لكل نصيب؛ وكل يكمل الآخر من الذكر والأنثى.

إن الإسلام قد ساوى بين المرأة بما يناسب الفطرة، وبما يحقق للمرأة الكرامة والشرف والعفة، فهناك بعض تكاليف الشريعة خفف الله بها عن المرأة..

تقول الباحثة والكاتبة الإنجليزية الليدي إيفلينكوبولد: لما جاء الإسلام ردّ للمرأة حرياتها، فإذا هي قسيمة الرجل، لها ما له، وعليها ما عليه، وهو يلي رياستها ويحوطها بقوته، ويذود عنها بدمه، وينفق عليها من كسب يده، فأما فيما سوى ذلك فهما في السراء والبأساء سواء..

فمبدأ المساواة لا يعني عدم قيام كل من الرجل والمرأة بدوره الخاص الذي يلائم طبيعته، ووضعه، فالرجل مطالب بالخروج من البيت والتكسب له ولأهله، والمرأة مطلوب منها القرار في البيت والعناية بزوجها وأبنائها، كما في الحديث: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ فِي أَهْلِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا))[٢٠].

أما حق المرأة في المال والملك والمسؤولية والثواب والعقاب الدنيوي والأخروي فيستوي فيه الرجال والنساء، وأما ما اختلف فيه الرجل والمرأة في بعض الأحكام فأمر طبيعي متقرر في الشريعة الإسلامية..

ويرى الأستاذ عباس محمود العقّاد: أن المرأة تختلف عن الرجل في كثير من الظواهر والبواطن: في مادة الدم، ونبضات القلب، وعوارض التنفس، وفي سحنة الوجه، وحجم الدماغ، وهندام الجسم، ونغم الصوت، ولا يَزعم أن المرأة هي الرجل أو الرجل هو المرأة، إلا من ينكر الحس، ويناقض البداهة..

يقول المستشرق الفرنسي جاك ريسلر: لقد وُضعت المرأة في الإسلام على قدم المساواة مع الرجل في القضايا الخاصة بالمصلحة، فأصبح في استطاعتها أن ترث وأن تورث، وأن تشتغل بمهنة مشروعة، لكن مكانها الصحيح هو البيت، كما أن مهمتها الأساسية أن تنجب أطفالاً..

فالمساواة بين الرجل والمرأة لا تعني أن تكون المرأة رجلاً، ولا أن تخرج من حماها المنيع، ولا أن تنزل من عرشها الرفيع، وتنسلخ من فطرتها الرقيقة..

يقول ولزلي: إن المرأة والرجل جنسان مختلفان اختلافا كاملاً شاملاً، وإذا كنا نسلِّم بالمساواة بينهما في الحقوق فإن المساواة بينهما في الجنس مستحيلة استحالة مادية..

ويقول العالم الروسي أنطون نيميلاف: إنه لا مساواة بين الرجل والمرأة كما أثبتت ذلك تجارب العلوم الطبيعية، ولم تكلفها الفطرة بأعباء.. [٢١].

ثالثاً: من أمثلة الحقوق التي ساوى الإسلام فيها بين المرأة والرجل:

من مظاهر المساواة في الشريعة الإسلامية:

المكافأة والثواب الأخروي:﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (٢٢).الوعيد للذين يؤذون المؤمنين والمؤمنات بغير حق على السواء:﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا﴾ (٢٣).الدعاء والاستغفار لجميع المؤمنين من الرجال والنساء: ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ﴾ (٢٤).

ويمكن تفصيل هذه الحقوق على النحو التالي:

١- الحقوق السياسية:

حفظ الإسلام للمرأة الحق في مبايعة الحاكم كالرجل، قال تعالى:﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (٢٥).

تقول الباحثة الإنجليزية فيوليت ديكسون: لقد كانت الأميرة نورة تقف دائماً إلى جانب شقيقها عبد العزيز من قبل أن يصبح ملكاً، وبعد أن استعاد الرياض من ابن رشيد كانت تمده بالمؤازرة والمشورة، ولم يمر يوم واحد لم يزرها فيه الملك في دارها، وكانت زياراتها للقصر والمشاورات بينها وبين شقيقها كثيرة جداً، كان قصرها مفتوحاً دائماً لكل سيدات الجزيرة. ولما توفيت حزن عليها الملك عبد العزيز حزناً شديداً؛ لأنه فقد أحد أركان وزرائه في السياسة، تقول السيدة ديكسون: كان حزن الملك عبد العزيز عليها شديداً، وما أن يفكر إلا بالإحسان

إلى كل المحزونين، وهكذا أصدر أمره الملكي بإطلاق حرية السجناء في كل بلدان المملكة، وأبلغ أمره فوراً باللاسلكي إلى أمراء المقاطعات بأن يؤمن لكل رجل فقير في المملكة لم يستطع أن يحج إلى مكة؛ لعجزه وفقره الحج على نفقته الخاصة ذهاباً وإياباً.

وها هي الأميرة حصة الشعلان حرم خادم الحرمين الشريفين الملك عبد الله بن عبد العزيز تشارك المرأة السعودية حياتها العامة، ومن ذلك رعايتها لأكبر ندوة علمية عن المرأة السعودية ورحلتها في طلب العلم.ويقول الملك عبد العزيز بن عبد الرحمن آل سعود: شرع الدين الإسلامي للنساء حقوقاً يتمتعن بها.

وكانت الأميرة موضي زوجة الإمام محمد بن سعود هي التي حملت زوجها على نصرة إمام الدعوة الإصلاحية محمد بن عبد الوهاب، فكانت ثمرة هذا التناصر تأسيس الدولة السعودية الأولى.

يقول المفكر الفرنسي مارسيل بوازار: أثبتت التعاليم القرآنية وتعاليم محمد ﷺ أنها حامية حمى حقوق المرأة التي لا تكلّ.

ومن حقوقها السياسية في المملكة العربية السعودية القرار الذي أصدره خادم الحرمين الشريفين الملك عبدالله بن عبدالعزيز –حفظه الله– بتعيين عدد من النساء في عضوية مجلس الشورى.. (٢٦).

وقد أكد العلماء والمشايخ في المملكة بأنه قرار شرعي صحيح يدعمه الدليل الشرعي ويعطي للمرأة حقها الشرعي ومكانتها التي بوأها لها دينها الحنيف.. وأن هذا القرار يستند إلى نصوص الكتاب والسنَّة..

وقال أصحاب الفضيلة: إن دخول المرأة في مجلس الشورى هو في حقيقته أنموذج يعكس حق المرأة في الاستشارة وتطبيق عملي لنظرة الإسلام للمرأة، مؤكدين

أن ذلك يُعد تتويجاً لنهج أصيل في بناء الدولة المسلمة التي قامت على أيدي الرجال والنساء على حد سواء ودون تهميش لأي منهما.. وأكدوا أن هذا الأمر الملكي الذي يُعد تاريخياً بكل المقاييس لا تعوزه أبداً الأدلة والشواهد والأمثلة على مدار التاريخ الإسلامي كله، بل الأدلة والشواهد تعضده وتؤكد هذه المكانة للمرأة المسلمة التي بوأها لها دينها العظيم.. وأشاروا إلى أن المرأة المسلمة وعلى امتداد التاريخ الإسلامي قد قامت بدور ريادي مشهود في خدمة الأمة وخدمة مجتمعها وأنها قد أسهمت في مجالات متعددة ومنها الجهاد والافتاء وهما أمران أعظم وأخطر من مجرد الاستشارة..

فيما أشاد أصحاب الفضيلة العلماء والمشايخ بالضوابط الشرعية التي تضمنها الأمر الملكي وقالوا: إنها ضوابط نابعة من أحكام الدين ومن التزام هذا البلد الإسلامي الكبير بنصوص الوحيين وقواعد الشريعة مؤكدين أن خادم الحرمين الشريفين الملك عبدالله بن عبدالعزيز حريص كل الحرص على أن تكون هذه المشاركة في أعمال مجلس الشورى منضبطة بقواعد الدين..

وقد تحدث عميد معهد الأئمة والدعاة برابطة العالم الإسلامي فضيلة الدكتور حسن بن على الحجاجي حول الأمر الملكي الخاص بتمثيل المرأة في مجلس الشورى بثلاثين مقعداً فقال: إن للمرأة في الإسلام مكانة تدل على التقدير والإجلال لها، والنساء شقائق الرجال، والمرأة في الإسلام هي الأم والبنت والأخت والزوجة؛ لذا أعطاها الإسلام حقها كاملاً في التوريث والملك، وفي الموافقة على اختيار الزوج، وهي مساوية للرجل في العبادات والأحكام والتشريع إلا ما كان خصوصية لها.

لذلك فإن القيادة الحكيمة في بلاد الحرمين وهي تولي المرأة الاهتمام الفائق، ففتحت الجامعات والمدارس وأسهمت في حركة التوظيف والتمريض، وبعض الأعمال الاقتصادية.

وأضاف: نرى اليوم خادم الحرمين الشريفين –وفقه الله ورعاه– قد بوأ المرأة مكانة في مجلس الشورى، وهي بادرة وجدت الترحيب واستحقت التقدير في كثير من الأوساط الاجتماعية، وقد ثبت في السيرة النبوية أن الرسول ﷺ استشار بعض نسائه في قضايا مهمة، مثل استشارته لأم سلمة في غزوة الحديبية، عندما أبرم صلى الله عليه وسلم مع قريش صلحاً، وطلب من أصحابه أن يتحللوا من إحرامهم، فترددوا لحظة، فقالت له يارسول الله اذهب وانحر هديك واحلق شعرك وحل احرامك دون أن تكلم أحداً، وفعل ذلك، وبادر أصحابه بالتحلل، كما أنه بتقصي سيرة أم المؤمنين السيدة عائشة رضي الله عنها نجد أن لها الكثير من المرويات في أحاديث رسول الله ﷺ ، كما كان للنساء دور في مرافقة الجيش، ومداواة الجرحى وغيرذلك من المهام..

لذا رأينا الأمر الملكي الكريم من خادم الحرمين الشريفين وفقه الله بالاستفادة من العنصر النسائي في مجلس الشورى وهو رأي متفق مع ما في شريعتنا من الاستفادة من المرأة بالضوابط الشرعية التي لم تخف على خادم الحرمين وفقه الله فليس لنا إلاّ أن ندعو له بطول العمر في طاعة الله، وأن يوفقه ويسدد على طريق الخير خطاهُ.. والله الموفق والهادي إلى سواء السبيل..

وقال فضيلة الشيخ الدكتور إبراهيم بن ناصر الحمود الأستاذ بالمعهد العالي للقضاء والأستاذ بكلية الشريعة بالرياض سابقاً ووكيل المعهد العالي للقضاء سابقاً.. معلقاً على الأمر الملكي بدخول النساء عضوية الشورى:

أولاً: المرأة في الإسلام أخذت حقوقها كاملة وفق طبيعتها الإنسانية وما يتفق مع تكوينها العقلي والجسماني، وكانت في صدر الإسلام تسهم بما لها من قدرات وإمكانات في السلم والحرب، والرسول ﷺ جعل للنساء يوماً يعظهن فيه ويقضي حوائجهن وقوله ﷺ : (قد أجرنا من أجرتِ يا أم هانئ) دليل على قبول شفاعة المرأة والأخذ برأيها، ولما اشتكت امرأة أبي سفيان بأن زوجها شحيح لا يعطيها ما يكفيها حكم لها الرسول ﷺ دون أن يسمع من زوجها مما يدل على أن لها الحق في المطالبة بحقها وأن الأصل صحة دعواها، وقبل النبي ﷺ رأي المرأة التي وهبت نفسها له ترغب الزواج منه ولما نظر إليها لم ترق له فرغب فيها أحد الصحابة وتزوجها، فقبول عرضها وعدم رفضه دليل على قبول رأيها وأنها أولى بمعرفة مصلحتها، وكذلك قصة المرأة التي اشتكت وليها لكونه زوجها بدون رضاها فرد الرسول ﷺ نكاحها وأخرى خيَّرها، وفي الحديث الصحيح: ((لا تنكح البكر حتى تستأذن ولا الأيم حتى تستأمر)) وفي لفظ ((الأيم أحق بنفسها من وليها)) كل ذلك يدل على اعتبار رأيها وقبوله شرعاً.

ثم إن المرأة البالغة العاقلة لها حق التصرف في مالها وفي شؤون حياتها كالرجل لكمال أهليتها، ولها حق الحضانة والولاية على الصغار، وكذلك قبول شهادتها وإقرارها وسماع دعواها، وهي المرأة العاملة في محيط بنات جنسها، فالإسلام أعلى مكانة المرأة بعد أن كانت قبل الإسلام منبوذة مهانة تُعد من سقط المتاع.. فالمرأة عبرالتاريخ الإسلامي شاركت في الجهاد والعمل والإفتاء والطب والصيدلة والثقافة..

ثانياً: دخول المرأة في مجلس الشورى يُعد أنموذجاً من حق المرأة في الاستشارة، وهو تطبيق عملي لنظرة الإسلام للمرأة وأن النساء شقائق الرجال، ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف، ورأيها معتبر ما دامت كاملة الأهلية كالرجل..

ثالثاً: خادم الحرمين الشريفين – وفقه الله – أدرك أهمية مشاركة المرأة في مجلس الشورى، وقد أصاب حين جعلها عضواً في المجلس، لأن مصالح المجتمع لا تقتصر على حقوق الرجال فقط، فكما أن الرجل له حرية الرأي فكذلك المرأة المؤهلة علمياً وفكرياً، ولا يقتصر رأيها على حقوق النساء فقط فقد يكون لها رأي مقدم على رأي الرجل، لأن المعيار ليس الجنس وإنما الرأي السديد، ولكثير من النساء مواقف قد يعجز عنها بعض الرجال، فالرأي والحكمة موهبة من الله لا تخص جنساً دون جنس..

رابعاً: المرأة في الإسلام لها دور ريادي وكونها لا تتولى القيادة الكبرى لا يدل على ضعفها من كل وجه، وإنما لها خصوصياتها التي تناسب طبيعة خلقتها والمحافظة على عفتها وكرامتها، فليس الذكر كالأنثى كما أخبر الله تعالى مما يدل على وجود فرق في القدرة على التحمّل لا في إبداء الرأي والمشورة..

خامساً: استشارة المرأة جائزة شرعاً سواء فيما لا يقدر عليه إلا النساء أم غير ذلك لأنها امرأة كاملة الأهلية، ولذلك شواهد في عصر صدر الإسلام وما بعده يضيق المقام لذكرها..

سادساً: المرأة مؤهلة شرعاً للمشاركة في الشورى في الدولة لعدم وجود المانع، ولأن الحاجة داعية إليها في بعض المواقف، فهي مكملة للمشورة مع الرجل، بل من القضايا المطروحة في المجلس ما يحتاج فيه لرأي المرأة، وسيتضح ذلك من خلال تفعيل هذه المشاركة سواء في جانب التعليم أم التأهيل أم غير ذلك من قضايا المجتمع..

فالمرأة جزء لا يتجزأ من المنظومة الفكرية، وهي عنصر فاعل في المجتمع..وستثري مشاركتها أعمال المجلس، وسيكون لها دور بارز في الطرح والمناقشة، فمن النساء من تفوقن على الرجال في التعليم والمهارات الأخرى. والواقع

يشهد لذلك، والمجتمع السعودي يحظى بعدد كبير من النساء المؤهلات علمياً وفكرياً، ومنهن من تم ترشحهن لعضوية المجلس فهو اختيار موفق، نسأل الله لهن التوفيق والسداد..

وقد أكَّد فضيلة الدكتور عبدالرحمن الحازمي المستشار في وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد والعضو في الهيئة العالمية للتعليم الإسلامي التابع لرابطة العالم الإسلامي ومدير عام فرع وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد بالمنطقة الغربية سابقاً فقال: المرأة هي الأم، والجدة، والعمة، والخالة، والزوجة، والبنت، والأخت وتمثل التراحم والتكافل والترابط والمحبة فيما بينهم.

كما أنّ دور المرأة في إصلاح المجتمع دور لهُ أهمية كبرى، فهو دور مهم ومحوري، وذلك لأنها نصف المجتمع، كما أن نشأة الأجيال أول ما تنشأ إنما تكون في أحضان النساء، وبه تتبين أهمية ما يجب على المرأة في إصلاح المجتمع..

ودخول المرأة في مجلس الشورى فرصة أمام نصف المجتمع بحيث يكون فاعلاً ومؤثراً ومشاركاً في القرارات التي من شأنها أن تسهم في حركة التطوير والتنمية التي تشهدها المملكة العربية السعودية في كل قطاعاتها.. والخطوة تمثل مقدار الاهتمام الذي يوليه خادم الحرمين الشريفين الملك عبدالله بن عبد العزيز آل سعود حفظه الله بالمرأة وقضاياها، والاستفادة من العنصر النسائي في مجلس الشورى..

فيما وصف الشيخ الدكتور أحمد بن عبدالله الفريح مدير المعهد العالي للأمر بالمعروف والنهي عن المنكر بجامعة أم القرى تنصيب المرأة عضواً في مجلس الشورى بالأمر الجيد، موضحاً أن النساء يعرفن أحوالهن الخاصة وما يخص بني جنسهن وهي خطوة ناجحة وجيدة أي تعيين عضوات في المجلس لكن المهم برأيه أن يبقى رأي المرأة في المجلس خاضعاً للحدود الشرعية ومن الطبيعي أن يكون راعى

في اختيارهن أنهن متخصصات ولهن اطلاع بالعلم الشرعي ودراية بالأحكام وحقوق المرأة وعليها ألا تستقل برأيها بعيداً عن الشريعة وما جاء في الكتاب والسنّة وآراء العلماء الأفاضل..

وأكدالدكتور توفيق بن عبدالعزيز السديري وكيل وزارة الشؤون الإسلامية لشؤون المساجد والدعوة والإرشاد أن مشاركة المرأة جاءت في الوقت المناسب بعد أن وصلت المرأة السعودية إلى درجة متقدمة من التعليم والعمل في شتَّى مناحي الحياة ما يتطلب معه مواكبة ذلك بمشاركتها في اتخاذ القرار والرأي والمشورة في إطار ضوابط الشرع الحنيف.. ولفت السديري إلى أن قرار المشاركة ينطلق من إدراك ووعي خادم الحرمين الشريفين –رعاه الله– لمتطلبات المرحلة وشجاعة قائد أمة وباني نهضة مؤمن بالله ومتوكل عليه، ومستند إلى تراث ديني ضخم وعريق.

يقول د. محمد الشريف: دخول المرأة في عضوية مجلس الشورى أمر جائز شرعاً.. وهو قرار إيجابي لمصلحة المجتمع.. وأشار إلى أن المرأة العربية المسلمة كانت عبر التاريخ صنو الرجل والرسول ﷺ قال: "النساء شقائق الرجال"، وقد أعطى الرسول ﷺ المرأة حقها منذ اللحظات الأولى لبناء الدولة الإسلامية، حيث أشركها في مهام خطيرة وكبيرة، حيث اشتركت المرأة في بيعة العقبة التي كانت بذرة إنشاء الدولة في الإسلام..

واستشهد في هذا الصدد بدور أم المؤمنين خديجة بنت خويلد رضي الله عنها في دعم ومساندة الرسول ﷺ في بداية بعثته، وكذلك ما قامت به أسماء بنت أبي بكر الصديق رضي الله عنهما من دور خطير أثناء عملية الهجرة من مكة إلى المدينة، والأمثلة كثيرة لما قامت به أمهات المؤمنين والصحابيات الجليلات من دور في بناء دولة الإسلام الأولى في مختلف مناحي الحياة السياسية والاقتصادية والعسكرية والعلمية والفكرية مروراً بنساء المؤمنين في عهد الخلفاء الراشدين وما تبعه

من عصور النهضة الإسلامية، ما يؤكد أن المملكة بقيادة خادم الحرمين الشريفين باتخاذ مثل هذه القرارات تستند إلى تراث إسلامي عظيم لا يهمش المرأة ولا يهضمها حقها، بل يعطيها إياه في الوقت والمكان المناسبين..

٢- الحقوق المالية:

يقول الله تعالى: ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ (٢٧)، فأمر بإعطاء المرأة حقها من المهر كاملاً، وليس للزوج أن يأخذ منه شيئاً إلا ما أعطته الزوجة عن طيب نفس، كما قال الله تعالى: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۗ﴾ (٢٨)، وبهذا جعل الإسلام للمرأة حقاً مستقلاً وذمة خاصة، منفصلة حتى عن زوجها تتيح لها التصرف في مالها كما تشاء..

ثم إن المرأة المسلمة تتمتع بحق الوراثة مثل إخوتها، وبحقها في ألا تُزفّ إلى أحد إلا بموافقتها الحرة، وفي ألا يسيء زوجها معاملتها، وتتمتع أيضاً بحق الحصول على مهر من الزوج، وبحق إعالته إياها ونفقته عليها، كما تتمتع بأكمل الحرية إذا كانت مؤهلة لذلك شرعياً في إدارة ممتلكاتها الشخصية..

٣- الحقوق الإجتماعية:

عن سهل بن سعد رضي الله عنه قال: كانت لنا عجوز تأخذ من أصول السلق فتطرحه في القدر، وتكركر حبات من شعير، فإذا صلينا الجمعة وانصرفنا، نسلِّم عليها، فتقدمه إلينا (٢٩).وهذا فيه صورة من التواصل الاجتماعي في الضيافة والإكرام وهو من الحقوق الاجتماعية.

وأما العمل الاجتماعي للمرأة في المملكة العربية السعودية: فخير مثال عليه ما تقوم به في الجمعيات الخيرية، ودور رعاية الأيتام، حيث تقدم المرأة أعمالاً

تطوعية جليلة للمجتمع من خلال هذه الجمعيات، ومن أمثلتها: جمعية الوفاء الخيرية، التي ترعى حقوق المرأة من خلال:

١- المساهمة في رفع مستوى الأسرة السعودية دينياً واجتماعياً واقتصادياً وصحياً وتعريفها بحقوقها المختلفة.

٢- رعاية الطفولة والأمومة وبين الحقوق والواجبات المتبادلة للأم والطفل.

٣- توعية المرأة السعودية بدورها في المجتمع وتحديد حقوقها وواجباتها.وتضم جمعية الوفاء ما يقرب من ثلاثمائة وخمسين عضوة ما بين عاملة ومنتسبة، كما تضم الجمعية ثمان لجان، لكل منها أهداف وأعمال ورئيسة وعضوات.

وهناك رسالة للباحثة نوال بنت حسن آل الشيخ بعنوان: "مدى ما استفادته المرأة السعودية من برامج التنمية"، حيث يكشف هذا البحث وغيره من الأبحاث المماثلة عن مدى الاهتمام بالحقوق الاجتماعية للمرأة، وسبل التنمية الاجتماعية للوسط السعودي في التعليم والعمل، للحفاظ على حقوق المرأة السعودية والتعريف بها.

٤- الحقوق التعليمية:

من وجوه المساواة بين المرأة والرجل في الإسلام التعليم ومشاركته العمل، فعَنْ أَبِي سَعِيدٍ: جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِيثِكَ، فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ نَفْسِكَ يَوْمًا نَأْتِيكَ فِيهِ تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللَّهُ، فَقَالَ: «اجْتَمِعْنَ فِي يَوْمِ كَذَا وَكَذَا فِي مَكَانِ كَذَا وَكَذَا»، فَاجْتَمَعْنَ، فَأَتَاهُنَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ، فَعَلَّمَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَهُ اللَّهُ [٣٠].

قال الملك فيصل بن عبد العزيز آل سعود: لا بد للبنت أن تتعلم، ولا بد للبنات من كلية علمية.

وتحدثت الدكتورة ريتادة ميلية الأستاذة في جامعة روما بقولها: أن الحديث عن المرأة السعودية جزء من الحديث عن المرأة في الإسلام والدينِ الإسلامي في جوهره ومبادئه وتعاليمه، لقد زرت المملكة العربية السعودية وأبصرْتُ بأم عيني التطور الهائل الكبير الذي تم فيها بقيادة جلالة العاهل العظيم فيصل، ورأيت ما تحتلّه المرأة من مكانة ورعاية وما تقدمه من خدمة ونفع للمجتمع الصاعد الجديد، ورأيت المرأة في السعودية معلمة في المدرسة الابتدائية والثانوية والجامعة، رأيتها ممرضة في المستشفى، وطبيبة في عيادة، رأيتها مشرفة اجتماعية وهادية إلى سبل الخير والصلاح.

والمرأة في السعودية تتعلم كالرجل حتى المستوى الجامعي والدراسات العليا، وقبل خمسين سنة تقريباً كان هناك خمس عشرة مدرسة للبنات، وفي عام ١٤٢٠ هـ وصل عدد مدارس البنات في مختلف مراحلها إلى ما يزيد عن ثلاثة عشر ألف مدرسة ومعهد وكلية، ووصل عدد الطالبات إلى ما يزيد عن مليونين وخمسمائة ألف طالبة، وهذه قفزة هائلة لتطور تعليم الفتاة السعودية، حتى وصل تعليم البنات إلى كل بيت في المملكة، واشتمل على كل الفروع والأنواع، والتخصصات، التي تتناسب وطبيعة المرأة، وتخدم المجتمع وتلبي حاجاته، وتحقق أهداف الخطط التنموية المتعاقبة.

وقد حددت سياسة التعليم في المملكة الهدف من تعليم المرأة فيما يلي:

١- يستهدف تعليم الفتاة تربيتها تربية صحيحة إسلامية، لتقوم بمهمتها في الحياة، فتكون ربة بيت ناجحة، وزوجة مثالية، وأماً صالحة، ولإعدادها للقيام بما يناسب فطرتها كالتدريس، والتمريض والتطبيب..

٢- تهتم الدولة بتعليم البنات، وتوفر الإمكانات اللازمة ما أمكن؛ لاستيعاب جميع من يصل منهن إلى سن التعليم، وإتاحة الفرصة لهن في أنواع التعليم الملائمة لطبيعة المرأة، والوافية بحاجة البلاد..

وكذلك اهتمت المملكة بتعليم كبيرات السن، من خلال برامج محو الأمية التي تنتشر في كل مكان من البلاد..

وقد عملت الدولة على وضع سلّم خاص لرواتب المعلمين والمعلمات، يرفع من شأنهم، ويشجع على الاضطلاع بهذه المهمة التربوية في أداء رسالة التعليم بأمانة وإخلاص..

وكما افتتحت المملكة المدارس والمعاهد والكليات لتعليم الفتاة، فقد افتتحت لذلك أيضاً معاهد ومراكز التعليم الفني والتدريب المهني المتوسطة والثانوية، وكذلك المؤسسات التعليمية لذوي الاحتياجات الخاصة..

٥- الحقوق الثقافية:

شرع الإسلام حرية الرأي وجعلها حقاً للإنسان ذكراً كان أو أنثى، بل قد يكون إبداء الرأي واجباً محتماً في بعض الأحيان بحكم الشريعة الإسلامية..

ونرى ذلك واقعاً عملياً فيما قاله الملك عبد الله بن عبد العزيز آل سعود: إن المرأة السعودية هي الأم والأخت والزوجة والابنة، ولها تجاهنا حقوق في الحوار الفكري لخدمة الدين والوطن..

٦- الحقوق الإقتصادية والعمل:

أقر الإسلام للمرأة حقوقاً اقتصادية ومالية كثيرة، فقد أجاز لها التملك والتصرف فيما تملك من أموال وممتلكات، مع الحرية التامة في التصرف في مالها بالضوابط الشرعية التي جاء بها الإسلام، فلها حق البيع والشراء والإجارة والإعارة،

والمشاركة وغير ذلك، كما أقر لها حق النفقة على وليها أباً كان أو زوجاً، وأقر لها أيضاً حق الميراث، والحق في الصداق عند النكاح، والنفقة عند الطلاق، وغير ذلك.

قال سماحة الشيخ عبد العزيز بن عبد الله بن باز رحمه الله [٣١]"لا يمنع الإسلام عمل المرأة ولا تجارتها فالله جل وعلا شرع للعباد العمل وأمرهم به فقال: ﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾ [٣٢]، وقال: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [٣٣]، وهذا يعم الجميع الرجال والنساء، وشرع التجارة للجميع، فالإنسان مأمور بأن يتجر ويتسبب ويعمل سواء كان رجلا أو امرأة"، قال تعالى: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ﴾ [٣٤]. وفي المملكة العربية السعودية قطعت المرأة شوطاً لا بأس به في مجال العمل الحر في التجارة وتداول رؤوس الأموال، والربح الحلال، وخدمة مصالح البلد..

تقول الأمريكية جوليا هندرسن: أودّ أن أشيد بوجه خاص بالجهود الصادقة نحو تقدم المرأة السعودية واشتراكها في النهضة الشاملة للمملكة علمياً واقتصادياً.

وعن مشاركات وواجبات المرأة السعودية تقول الأميرة شيخة بنت عبد الرحمن آل سعود: إن في اشتغال المرأة في الفترة الأخيرة واهتمامها بالأسواق النسائية ظاهرة جيدة. وتقول: مشاركتي وأعمالي التي أقوم بها لا أعدها إلا جهداً قليلاً أقدمه لهذا البلد الكريم.

ولتأهيل المرأة السعودية في مجال العمل الصناعي وممارسة حقها المالي والاقتصادي، فإن أساسيات ذلك المبدأ موجود في المملكة ويتمثل في المعارض

الفنية التي تقيمها مدارس البنات سنوياً وتعرض فيها منتجات الطالبات الفنية والصناعية من الملابس وأدوات المطبخ ونماذج المفروشات والنسيج.

يقول الملك عبد العزيز بن عبد الرحمن آل سعود: ولا يمنع من تقدمنا في مضمار الحياة والرقي إذا وجّهنا المرأة إلى وظائفها الأساسية، وهذا ما يعترف به كثير من الأوروبيين من أرباب الحصافة والإنصاف.ثم يقول: والأوربيون يقدِّرون لنا تمسكنا بديننا وتقاليدنا، وما جاء به نبينا من التعاليم التي تقود البشرية إلى طريق الهدى وساحل السلامة.

٧- الحقوق المعنوية:

قرر الإسلام للمرأة المساواة في كثير من الحقوق التي كان ينفرد بها الرجل قبل الإسلام، فأصبحت المرأة مكفولة الحقوق، مصانةً عن السوء والشر، لها كرامة كبيرة، وخصها بحفظ كرامتها وعفتها وطهرها، فعن أسماء بنت يزيد رضي الله عنها: "أن رسول الله ﷺ مرّ يوماً في المسجد، وعُصبة من النساء قعود، فألوى بيده بالتسليم"[35]، ففيه تكريم للمرأة وحقوقها الآدمية والإنسانية؛ لأن ذلك من الآداب العامة التي يتساوى فيها النساء والرجال.

٨- الحقوق الأُسَرية:

إن من أعظم الحقوق في الإسلام هو حق الزوجة،يقول الله تعالى: ﴿**وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ**﴾ [٣٦]، وقال الرسول ﷺ لمن سأله: ما حق زوجة أحدنا عليه؟ فقال: تُطْعِمُهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ، وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ [٣٧].كما أن لها الحق في اختيار زوجها، بقوله ﷺ: "لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ، وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ "، قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ، وَكَيْفَ إِذْنُهَا؟ قَالَ: " أَنْ تَسْكُتَ "[٣٨].وقد حصل أن رجلاً زوّج ابنته ممن لا تريده

وهي الخنساء بنت خذام الأنصارية زوّجها أبوها فكرهت ذلك فأتت رسول الله ﷺ فرَّد نكاحهَا [٣٩].

يقول ابن القيم: إن البكر البالغة العاقلة الراشدة لا يتصرف أبوها في أقل شيء من مالها إلا برضاها، ولا يجبرها على إخراج اليسير بدون رضاها، فكيف يجوز أن يزوجها نفسها بغير رضاها، ومعلوم أن إخراج مالها كله بغير رضاها أسهل عليه من تزويجها بمن لا تختاره[٤٠].

يقول الكونت دي كاستري: ومن الخطأ الفاضح والغلو القادح قولهم: إن عقد الزواج عند المسلمين عبارة عن عقد تُباع فيه المرأة فتصير شيئاً مملوكاً لزوجها؛ لأن ذلك العقد يخول للمرأة حقوقاً أدبية وحقوقاً مادية، من شأنها إعلاء منزلتها في الهيئة الاجتماعية، فلها أن تشترط على زوجها عدم التزوج بغيرها، وألا يغيب أياماً كثيرة عن بيته بدون إذنها، وأن لا يؤذيها ولا يسبها، وأن لا يكلفها بأعمال البيت الشاقة، وهكذا فإن لم يف بهذه الشروط، جاز للمرأة أن تطلب منه على يد القاضي أن يصلح وضعها، أو أن يطلق ضرتها، ولم يقتصر القرآن في التضييق على تعدد الزوجات على عددهن، بل حرّم ما كان معروفاً عند العرب قبله من الزواج لزمن محدود أي زواج المتعة..

وتقول الكاتبة الإيطالية ريتادةميليو: أما حقوق المرأة السعودية وواجباتها فمنها حقها بمهر تستلمه عند عقد زواجها بمن ترضى، وواجب الزوج الإنفاق عليها وتدبير لوازم الأسرة، كاملة، على أن ترعى أمور البيت وتصونه، في وجوده وغيبته، إن سمو تكريمها يتجلى في حقها بعدم إرضاع ولدها إن شاءت ولا يجبرها مخلوق على هذا إن رفضت، والمرأة في كثير من الحالات التي بيَّنها الشرع الإسلامي لها أن تطلب الطلاق، وأن تشترط ذلك في عقد النكاح.

٩- حقوق المرأة بعد وفاتها:

ولئن حفظ الإسلام حق المرأة في حياتها، فهو محفوظ ومصان بعد موتها، فعن أبي هريرة رضي الله عنه: "أن امرأة كانت تقمّ المسجد ففقدها رسول الله ﷺ فسأل عنها فقالوا: ماتت، قال: "أفلا كنتم آذنتموني"، ثم قال: "دلّوني على قبرها، فدلُّه فصلى عليها" [٤١]، فهذا إكرام لتلك المرأة وبيان لمكانتها الإنسانية، وحقوقها الدينية.ونخلص من هذا كله أن الإسلام قد ساوى المرأة بالرجل في كافة الحقوق، وهذا هو المعمول به في المملكة، ومن أبرز تلك الحقوق:

الحق في الحياة الكريمة،إبداء الرأي والمشورة،الحقوق السياسية والإجتماعية، الحقوق المالية والتجارية منها ولها،حق التملك والتصرف والذمة،الحقوق المعنوية،حق المطالبة بالحقوق،حق الحفظ والرعاية والصيانة،حق الحفظ والرعاية والصيانة،حق التعليم والتدريب،حق العمل،الحقوق الصحية،الحق في الزواج والطلاق،الحق في إنجاب الأولاد،الحق في حضانة الأولاد،الحق في العبادة،الحق في الميراث،الحق في النفقة،حقها في ممارسة السلطة الرقابية على مثيلاتها.

المطلب الثالث: حق المرأة في التملك من خلال تقريرات الفقهاء رحمهم الله

الأصل أَنَّ وظيفة المرْأة الأولى هي إِدَارة بيتها ورعاية أسرتها وتربية أبنائها وحسن تبعلها، يقول النبي ﷺ : (المرأة راعيةٌ في بيت زوجها ومسئولة عنْ رعيتها) [٤٢]. وهي غير مطالبة بالإنفاق على نفسها، فنفقتها واجبة على أبيها أو زوجها؛ لذلك كان مجال عملها هو البيت، وعملُها في البيت يُساوي عمل المجاهدين[٤٣].

ومع ذلك فالإسلام لا يمنع المرأة منَ العمل فلها أَنْ تبيعَ وتشتريَ، وأنْ تُوَكِّل غيرها، ويُوَكِّلَها غيرُهَا، وأَنْ تُتَاجِرَ بمالها، وليس لأحدٍ منْعها مِنْ ذلك ما دامتْ مراعيةً

أحكام الشَّرْع وآدابَه، ولذلك أبيح لها كَشْف وجهها وكفيها، قال الفقهاء: لأنَّ الحاجة تدعو إلى إبراز الوجه للبيعِ والشراء، وإلى إبراز الكف للأخذ والإعطاء.

وفي الاختيار: لا ينظر الرجل إلى الحرة الأجنبية إلا إلى الوجه والكفين..؛ لأن في ذلك ضرورة للأخذ والإعطاء ومعرفة وجهها عند المعاملة مع الأجانب؛ لإقامة معاشها ومعادها لعدم من يقوم بأسباب معاشها [٤٤].

والنصوص الدالة على جواز عمل المرأة كثيرة، والذي يُمكن استخلاصه منها، أن للمرأة الحقَّ في العمل بشرطِ إذن الزوج للخروج، إن استدعى عملها الخروج وكانت ذات زوج، ويَسقط حقه في الإذن إذا امتنع عن الإنفاق عليها.جاء في نهاية المحتاج: إذا أعسر الزوج بالنفقة وتحقق الإعسار فالأظهر إمهاله ثلاثة أيام، ولها الفسخ صبيحة الرابع، وللزوجة –وإنْ كانت غنيةً– الخروجُ زَمَنَ المهلةِ نهارا لتحصيل النفقة بنحو كسب، وليس له منعها لأن المنعَ فيمقابل النفقة [٤٥].وفي منتهى الإرادات: إذا أَعْسَرَ الزوجُ بالنفقة خُيِّرت الزوجةُ بيْن الفسخ وبين المقام معه مع منع نفسها، فإن لم تمنعْ نفسها منه ومكَّنَته من الاستمتاع بها فلا يمنعها تَكَسُّبًا، ولا يحبسها مع عسرته إذا لم تفسخ لأنه إضرار بها وسواء كانت غنية أو فقيرة؛ لأنه إنما يملك حبسها إذا كفاها المئونة وأغناها عمَّا لا بدَّ لها منه [٤٦].

وكذلك إذا كان العمل من فروض الكفايات.. جاء في فتح القدير: إن كانت المرأةُ قابلةً، أو كان لها حق على آخر، أو لآخرَ عليها حق تخرج بالإذن وبغير الإذن، ومثل ذلك في حاشية سعدي جلبي عنْ مجموع النوازل[٤٧].إلا أن ابن عابدين بعد أن نقل ما في الفتح قال: وفي البحر عن الخانية تقييد خروجها بالإذن؛ لأن حقه مقدم على فرض الكفاية [٤٨].

هذا، وإذا كان لها مال فلها أنْ تُتَاجِرَ به مع غيرها، كأنْ تُشَارِكَهُ أو تَدْفَعَهُ مضاربةً دون إذن منْ أحد. جاء في جواهر الإكليل: قراض الزوجة أي دفعها مالاً لِمَنْ يَتَّجرُ فيه ببعض ربحه، فلا يحجر عليها فيه اتفاقا؛ لأنه من التجارة[٤٩].

وقد عقد مجمع الفقه الإسلامي مؤتمرا حول (تنظيم الأسرة في المجتمع الإسلامي) ومن مقررات وتوصيات هذا المؤتمر ما يأتي:

بيان حول السكان من رؤساء بعض الدول والحكومات:

أكد المؤتمر أن الإسلام وضع الأحكام الكفيلة بمواجهة جميع التغيرات الاجتماعية التي تتعرض لها الأسرة في المجتمع الحديث..

ونبه المؤتمر إلى ضرورة وضع دراسات علمية عن الأسرة، وإلى ضرورة معرفة الناس حكم الإسلام في ما يجد من أحوال وأحداث.

ويرى المؤتمر أن الإسلام قد أعطى المرأة من الحقوق ما يجب لها، وما لم يعطها غيره، وأن عمل المرأة في المجتمع أمر مشروع إذا احتاجت إليه أو احتاج إليه المجتمع المسلم، على أن تكون المرأة في عملها محافظة على دينها وعفتها وحشمتها، وألا يتعارض ذلك مع رسالتها الأساسية كزوجة وأم...ويستنكر المؤتمر أن تستغل أنوثة المرأة في أي مجال من مجالات عملها.. [٥٠].

وهكذا نرى بأن الإسلام قد أعطى المرأة حقوقها كاملة من حيث طبيعتها الخُلقية والخِلقية، وقد راعى الإسلام أنوثتها في التعامل مع الآخرين في التجارة وغيرها من شؤون حياتها الدنيوية..

الهوامش و الإحالات

١) سورة الإسراء:٧٠

٢) أخرجه البخاري في صحيحه، برقم: (٣٣٣١)، ومسلم في صحيحه، برقم: (١٤٦٨)

٣) رواه الترمذي في سننه،كتاب الطهارة، رقم الحديث: (١١٣), والإمام أحمد بن حنبل في مسنده: (٢٥٦/٦)

٤) سورة النساء:١

٥) تقدم تخريجه

٦) تقدم تخريجه

٧) سورة الأحقاف:١٥

٨) سورة الإسراء:٢٣، ٢٤

٩) رواه ابن ماجه في سننه، برقم: (٢٧٨١).وصححه الألباني في صحيح سنن ابن ماجه.

١٠) أخرجه النسائي في سننه، برقم: (٣١٠٤)

١١) أخرجه البخاري في صحيحه، برقم: (٥٩٧١)، ومسلم في صحيحه، برقم: (٢٥٤٨)

١٢) سورة النساء

١٣) تقدم تخريجه

١٤) رواه الترمذي في سننه، برقم: (٣٨٩٥)، وابن ماجه في سننه، بر قم: (١٩٧٧). وصححه الألباني في صحيح سنن الترمذي

١٥) رواه مسلم في صحيحه، برقم: (٢٦٣١)

١٦) رواه ابن ماجه في سننه، برقم: (٣٢٥١)، وصححه الألباني في صحيح ابن ماجه.

١٧) رواه البخاري في صحيحه، برقم: (٥٩٨٨)

١٨) رواه البيهقي في السنن الكبرى ٥٤٣/٣

١٩) آل عمران: ٣٦

٢٠) أخرجه البخاري في صحيحه، رقم الحديث: (٨٩٣)، ومسلم في صحيحه، رقم الحديث (١٨٣٠)

٢١) انظر: موسوعة حقوق الإنسان في الإسلام للأستاذ الدكتور عدنان الوزان، والمفصل في أحكام المرأة والبيت لعبد الكريم زيدان، وجامع أحكام النساء لمصطفى العدوي، والأسرة في الشرع الإسلامي لعمر فروخ.

٢٢) سورة الأحزاب:٣٥

٢٣) سورة الأحزاب:٥٨

٢٤) سورة محمد:١٩

٢٥) سورة الممتحنة: ١٢

٢٦) منقول عن جريدة الرياض الأربعاء، ١٤٣٤هـ الموافق ٢٠١٣م العدد (١٦٢٩١)

٢٧) النساء: ٤

٢٨) البقرة: ٢٢٩

٢٩) رواه البخاري في كتاب الأطعمة، باب السِّلق والشعير. رقم الحديث (٥٠٠٩)

٣٠) رواه البخاري في صحيحه، برقم (٧٣١٠)، ومسلم في صحيحه، برقم (٢٦٣٤)

٣١) انظر: مجموع فتاوى ابن باز ١٠٣/٢٨

٣٢) سورة التوبة، الآية ١٠٥

٣٣) سورة الملك، الآية ٢

٣٤) سورة النساء، الآية ٢٩

٣٥) رواه الترمذي في سننه كتاب الاستئذان والآداب، باب ما جاء في التسليم على النساء، رقم الحديث: (٢٦٩٧)، وقال: حديث حسن

٣٦) النساء: ١٩

٣٧) أخرجه أبو داود في سننه، في كتاب النكا، باب في حق المرأة على زوجها رقم الحديث: (٢١٤٢)

٣٨) أخرجه مسلم في كتاب النكاح، باب استئذان الثيب في النكاح بالنطق والبكر بالسكوت.رقم الحديث: (١٤١٩)

٣٩) أخرجه البخاري في كتاب النكاح، باب إذا زوج ابنته وهي كارهة فنكاحه مردود. رقم الحديث: (٤٨٤٥)

٤٠) انظر: زاد المعاد ٩٦/٥

٤١) رواه البخاري في أبواب استقبال القبلة، باب كنس المسجد والتقاط الخرق والقذى والعيدان، رقم الحديث: (٤٤٦)

٤٢) حديث تقدم تخريجه

٤٣) مختصر تفسير ابن كثير ٣ / ٩٣ ، والقرطبي ٥ / ٣٢ ، وابن عابدين ٢ / ٦٧٢، ٦٨٨.

٤٤) المهذب ١ / ٧١ ، والمغني ١ / ٦٠١ ، والاختيار ٤ / ١٥٦

٤٥) نهاية المحتاج ٧ / ١٤٧

٤٦) شرح منتهى الإرادات ٣ / ٢٥٢

٤٧) فتح القدير ٤ / ٢٠٨ ، وحاشية سعدي جلبي بهامش فتح القدير ٤ / ٢٠٧.

٤٨) ابن عابدين ٢ / ٦٦٥

٤٩) جواهر الإكليل ١٠٢/٢ ، ومنح الجليل ٢٨١/٣، وحاشية العدوي على الخرشي ٣٩/٦

٥٠) انظر: مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٤٤٥/٥

****

منهج القرآن الكريم في تربية الشباب المسلم

Quranic method in the breeding of Muslim youth

الدكتور سيد عبدالغفار بخاري*

الدكتور محمد رياض الأزهرى*

ABSTRACT

In the present age, youth occupy an important position and can play a very important role in reforming and improving the world conditions. In Quran several methods are suggested for character building of youth for example following "Uswa-e-Hasna" and by preaching and motivation of youth the fear Allah , the crated in their heard for reforming them. In some cases, the punishment can also reformed of youth.

Youth is an important entity of any human society. Particularly in an Islamic society, youth has great significance. Youth is considered as a junction of past, present and future. The role of young generation cannot be neglected in the building of character, changes in circumstances and development of society. Youth should play a positive and effective role against various evils, which are prevalent in human society.

What can be the religious social, political, ethical and educational duties of the Muslim? How can they play their role in reformation of society? How can they be bright stars of their country by fulfilling their duties? How can the whole humanity and particularly Islamic Ummah get benefits from their youth?

The answers to these questions are central idea and theme of this article, generally in the light of Islam and particularly in the light of seerah-un-nabwiyia. In following lines, it has been tried to impart feelings of high self-esteem in the young generation who have forgotten it. It is an effort to motivate the youth for practical actions.

Keywords: Muslim youth, Uswa-e-Hasna, Islamic Ummah, young generation, development of society

* أستاذ مساعد قسم الدراسات الإسلامية بجامعة الوطنية للغات الحديثة اسلام آباد باكستان

* أستاذ مساعد قسم الدراسات الإسلامية ومطالعة المذاهب بجامعة هزاره مانسهره

الحمد لله رب العالمين القائل: ﴿إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى﴾ والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين القائل :"إن الله يعجب من الشاب الذي ليست له صبوة "وعلى آله الأطهار وصحبه الأبرار ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين وبعد! والبحث يشمل ما يلي:

أولا: المقدمة

ثانيا: دراسة الموضوع وتتكون من ثلاثة مباحث:

المبحث الأول: تعريف التربية وأهميتها

تشتمل علي ثلاثة مطالب

المطلب الأول: مفهوم التربية لغة واصطلاحا

المطلب الثاني: أهمية التربية و أهدافها

المطلب الثالث: ميزات التربية الإسلامية و سماتها

المبحث الثاني: أهمية الشباب في المجتمع

تشتمل علي مطالبين

المطلب الأول: مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام

المطلب الثاني: عناية الإسلام بالشباب في المجتمع المسلم

المبحث الثالث: منهج القرآن في التربية الإيمانية للشباب

تشتمل علي مطالبين

المطلب الأول: طرق وأساليب التربية القرآنية

المطلب الثاني: جوانب التربية الإسلامية في القرآن

ثالثا: الخاتمة النتائج والتوصيات والمقترحات

التوطئة : إن الشباب بالإسلام هو العطاء وهو الخير وهو البناء وهو بغير الإسلام تعاسة وبلاء. فالشباب طاقة يسخرها الإسلام في عمارة الكون وقد يسخرها الآخرون في إهلاك البشرية.وشباب الإسلام على الأخص هم عماد الحضارة

الحقيقية التي انبثقت من أم القرى تلك الحضارة التي خرجت للناس من عبادة العباد إلى عبادة رب العباد ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام.

ولقد أدرك أعداء الإسلام هذا الأثر لشباب الأمة الإسلامية وادركوا معه السبب الذين يبلغون به هذا الأثر فوضعوا مخططاتهم وبذلوا مجهوداتهم للحيلولة دون الشباب فأصبح شباب الإسلام يواجه فتنا متنوعة تهدف إلى أضعاف إيمانهم وأذابة شخصياتهم.فشباب اليوم يواجه تحديات شتى من بينها: مشكلة الانحراف في الدين والخلق والعمل ،والتيارات الفكرية الخطيرة.وسيطرة ثقافة الحضارة الغربية العلمانية، وافشاء الجهل،اضافة إلى ذلك خلو المناهج التربوية في أكثر الدول الإ سلامية.

لقد وضع الإسلام منهجا كاملا لتربية الشباب ولا شك أن أفضل المناهج وأكمل الطرق في تربية الشباب، منهج القرآن في تربية الشباب.وللمساهمة في حل المشكلات التي يواجهها الشباب اليوم وتشخيصا لمرض من أمراض شباب الأمة الإسلامية ، ووقوفا على علة من عللها المهلكة الدائمة،و لمعالجة مشكلاتهم، وتلبية حاجاتهم، وصونهم من كل انحراف، وإعدادهم إعدادًا سليمًا قويًا في الدين والخلق والسلوك. وتحقيقا عن العلاج الناجح والشفاء العاجل لذلك الداء الخطير، قمت بكتابة هذا البحث.

وأسأل الله سبحانه وتعالى التوفيق والسداد و أن ينفع بهذا الجهد المتواضع الأمة ويجعله رمز وفائي لهم وينفعني به في الدنيا والآخرة.

المبحث الأول : تعريف التربية وأهميتها

المطلب الأول : مفهوم التربية لغة واصطلاحا

التربية لغة : كلمة التربية مصدر الفعل (ربّ) ومنه الرب وتدل علي ثلاثة أصول لغوية منها رَبا يربو بمعنى زادَ ونما ،فتكون التربية هنا بمعنى النمو والزيادة،كما في قوله تعالى ﴿ يَمْحَقُ اللّهُ الْرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (1)

الأصل الثاني:رَبَى يربي على وزن خفى يخفي،وتكون التربية بمعنى التنشئة والرعاية،كما في قوله تعالى:﴿ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾[٢]

الأصل الثالث:رب يرب على وزن مدّ يمدّ بمعنى أصلحه،وتولى أمره، وقام عليه تقول ربيت القوم : أي سُسْتُم أي كنت فوقهم.[٣] تتضمن التربية هذه الدلالات الغوية المتعددة ، تركز جميعها على ما ينبغي أن تتضمنه العملية التربوية من أنشطة.

التربية اصطلاحاً:تختلف أقوال العلماءفي بيان مفهوم التربية ولكن لا تخرج تعريفاتهم عن المعنى اللغوي للكلمة. يقول الإمام الراغب الأصفهاني " التربية وهي إنشاء الشيء حالاً فحالاً إلى حد التمام"[٤].

وفي هذا الصدد يقول الإمام البيضاوي " التربية وهي تبليغ الشيء إلى كماله شيئاً فشيئاً،ثم وصف به تعالى للمبالغة"[٥].

ويرى ابن سينا في تعريفه للتربية " أنها وسيلة إعداد الناشئ للدين والدنيا في آن واحد وتكوينه عقلياً وخلقياً وجعله قادر على اكتساب صناعة تناسب ميوله وطبيعته وتمكنه من كسب عيشه "[٦].

أما ابن خلدون فقد أكد في آرائه التربوية على" ضرورة العناية بتنمية عقل المتعلم ومراعاة استعداداته العقلية "[٧].

ويمكن القول بصفة عامة أن التربية : يُقصد به التحلي بالمحامد من الأخلاق الفاضلة والصفات العالية والطباع والإبتعاد عن القبائح و الرزائل،ويتضمن التأديب معنى الإصلاح والنماء.

وهذا المفهوم ورد في قوله ﷺ لأَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ،خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَتَصَدَّقَ كُلَّ يَوْمٍ بِنِصْفِ صَاعٍ.[٨].

ويلاحظ أن لفظ الأدب في هذا الحديث يدل على تربية الأبناء وتنشئتهم على التحلي بمحاسن الأخلاق،وجميل الطباع .

مرادفات التربية ومعانيها في القرآن

١: الإصلاح: وهوضد الفساد قال تعالى:﴿إِنْ أُرِيدُ إِلاَّ الإِصْلاَحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلاَّ بِاللّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾(٩).

٢:التربية وهى التطهير قال تعالى:﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا﴾(١٠) اى طهر نفسه من الذنوب ونقاها من العيوب(١١) .

٣: التعليم قال تعالى:﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ ﴾(١٢).

٤: التنشئة قال تعالى: ﴿ أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ (١٣).

المطلب الثاني:أهمية التربية و أهدافها

لا ريب أن مسؤولية التربية من أهم المسؤوليات الملقاة على عاتق الوالدين والمربّين في حياتهم التي رسمها لهم الإسلام ، فالقرآن جاء لإنشاء أمة متكاملة تستهدي بنوره وتنطلق لتنظيم شؤونها واصلاح أوضاعها، لتتربّى الأفكار والعواطف والمواقف على أساس القواعد الكلية التي حدّدها الشارع الحكيم ؛ لتكون الروابط إسلامية والأخلاق السامية فإن حاجة الإنسان إلى التربية القرآنية لا تقل عن حاجته إلي الطعام والشراب ؛ فالإنسان ليس كامل العقل والحواس لأن العقول البشرية لا تستطيع وحدها إدراك مصالحها الحقيقة التي تكفل لها سعادة الدارين ، كما أنها لا تهدي وحدها إلى التمييز بين الخير والشر، والفضيلة والرذيلة، ومن ثمَّ، فإن معارفه ومداركه مهما وصلت إلى درجة عالية، فإنها تبقى قاصرة ومحدودة.

والتربية ليس مجرد أوامر ونواهٍ تلقّن أو تصدر للإنسان فيستجيب لها ، وإنما هي عملية تغيير للمحتوى الداخلي للإنسان ، وصياغة جديدة لأفكاره وعواطفه

وممارساته ،لذا يجب أن يكون القرآن هو المصدر الأساسي للتربية الذي يستمد منه المجتمع فكره التربوي، وأهدافه التربوية قال تعالى:

﴿وَأَنَّ هَـذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَـاتَّبِعُوهُ وَلَاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُـمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (١٤).

من هنا تتجلى أهمية التربية الإسلامية وقيمتها ويظهر ذلك من خلال نقاط تالية:

١.إن التربية الإسلامية تنظم حياة الإنسان مع الله عز وجل

٢. إنها تحقق السعادة للإنسان في الدارين

٣. التربية الإسلامية تنظم حياة المسلم مع مجتمعه الذي يعيش فيه

٤. التربية الإسلامية تعمل على تقوية الروابط بين المسلمين ودعم قضاياهم والتضامن معهم

٥. التربية الإسلامية تهتم بكل مقومات الإنسان اى الجسمية والعقلية والنفسية والوجدانية وتسعى إلى تحقيق التوازن التام بين كل هذه المقومات.

٦. التربية الإسلامية تقوم على جانبين المادي والروحي للإنسان دون الاقتصار على جانب واحد منها فقط.

أهداف التربية :

فللتربية الإسلامية أهداف سامية التى تدور على نوعين :

١: الهدف الخاص للتربية

٢: الهدف العام للتربية

الهدف الخاص للتربية الإسلامية هوالتقرب لله سبحانه و تعالى والاستعداد للحياة الأخروية فهو يتمثل في تحقيق معنى العبودية لله تعالى و هي اسم جامع لكل ما يحبُّه الله ويرضاه من الأقوال والأعمال الظاهرة والباطنة وهى لا تقتصر على

مجرد أداء مناسك و شعائر خاصة ، فالهدف الأساسي لوجود الإنسان في الأرض هو عبادة الله،والخضوع له، والتزام بأوامر الله وكفه عن نواهيه.وهذا هو الهدف الخاص الذي تعمل التربية الإسلامية على تحقيقه.

ويبين الإمام الغزالي الهدف الخاص للتربية قائلا "التقرب لله تعالى والاستعداد للحياة الأخروية ولذلك دعا إلى تربية الصبيان تربية دينية وخلقية قوامها التقشف والزهد في الملذات حتى البريئة منها "[١٥].

أما الهدف العام للتربية الإسلامية فهويتطلب تحقيق أهداف كثيرة

منها: تنشئة العقيدة الصحيحة لأفراد المجتمع المسلم؛لإعداد الفرد الصالح الذي يعبد الله سبحانه و تعالى على بصيرة وهدى.

منها: تهيئة المجتمع المسلم بالأخلاق الحميدة وبذلك يمكن للقيام بمهمة الدعوة إلى الله تعالى،والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر.

منها: تنمية روابط الأُخوَّة الإيمانية الصادقة والشعور الجماعي بين أبناء الأمة المسلمة حتى يرتبط بإخوانه ويهتم بقضاياه وهمومه وبذلك يرسخ لدى الفرد الشعور بالانتماء إلى مجتمعه.

منها: تكوين الفرد عضونافع للمجتمع وذلك بحسن التوجيه وحسن الحوار مع أفراد الأمة المسلمة ،ومعالجة مشاكلهم النفسية والعاطفيَّة.

منها: تكوين الفرد السليم عقليًّا وجسميًّا ،لكى يستطيع القيام بدوره وواجبه في عمارة الأرض واستثمار بركاتهاوخيراتها، وذلك بالقيام بأعباء الاستخلاف في الأرض ومهامه،التي جعله الله خليفته فيها.

المطلب الثالث: ميزات التربية القرآنية و سماتها

تمتاز التربية القرآنية بالميزات والسمات التالية :

١ : ربانية المصدر

تمتازالتربية القرآنية عن غيرها فهى ربانية المصدرفهى مستمد من القرآن الكريم فجميع ما يوجه ويضبط السلوك الإنسانى،ويحدد التعاملات والعلاقات فيما بينهم ومعايير القبول والرفض مصدره الرب سبحانه وتعالى وهذه الميزة تميزها التربية القرآنية عن التربيات الأخرى فهى ليست ربانية المصدربل مصدرها بشري.

٢: تربية تكاملية شاملة

اهتمت التربية القرآنية بالإنسان من حيث اصل تخلقيه ومشاعره واتجاهاته فهي تهتم بالجسد والعقل كما عنت الجانب الروحي عناية خاصة فهى لا تقتصر على جانب واحد منهما. فالتربية القرآنية تدعو إلى الاهتمام بالجسد ونظافته والعناية به،وتأمر العقل بالتفكر والتدبر.

فقد ركز القرآن الكريم على ذلك فعلق الفلاح على تزكيتها وعلق الخسران على تركها قال تعالى:﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾(١٦) بينما قد أغفلته التربيات الأخرى.

٣: تربية عملية

تؤكد التربية القرآنية على التوازن بين النواحي النظرية والعملية و حث القرآن على الجانب العملي في حياة الفرد والمجتمع وشجع عليه وبين أن الإيمان مرتبط ارتباطا وثيقا بالعمل ،وبين أن الإنسان يجزى بما عمل قال تعالى : ﴿ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى ، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى﴾ (١٧).

٤: تربية فردية وجماعية معا

تدعو التربية الإسلامية إلى إعداد الفرد إعدادا ايجابيا وتعتبره مسؤولا عن حياته و تصرفاته ،وتمنحه الحرية الكاملة في كل الأمور. وهي مع ذلك تدعو الفرد ليكون اجتماعيا متفاعلا ومؤثرا في المجتمع الذي يعيش فيه.فكما أن الإنسان مسؤول عن نفسه فهو مطالب بالانتماء إلى الجماعة والتفاعل معها تفاعلا إيجابيا.

٥: تربية مستمرة وابدية

التربية القرآنية ليست محدودة بفترة زمنية،ولا تنتهي بمراحل دراسية معينة، لأن القرآن صالح لكل زمان ومكان فالإنسان مهما تعلَّم وتطوَّر ووصل إلى مراتب علمية عالية يبقى يحتاج إليها في كل مراحل حياته وبالتالي فالتربية القرآنية مستمرة ومتتابعة لا تستغني عنه.

٦: تربية متدرجة

أنزل القرآن الكريم حسب الأحداث والوقائع، ولم ينزل دفعة واحدة ويضع لها الحلول المناسبة ويعالج المشاكل كلما حدثت ووقعت،وتدرجت تربية القرآن الكريم للأمة فلم يطالب الناس بكل الأحكام الشرعية دفعة واحدة بل راع فيها التدرج حسب قدرات الإنسان.

٧: الرقابة الذاتية على عمل الإنسان

التربية الإسلامية تنمي في الإنسان الرقابة الذاتية على عمله فتجعله يشعر برقابة الله عز وجل شعورا يمنعه من الإنحراف في السر والعلن ، قال تعالى:﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾(١٨).

فالمسلم الذي يربَّى تربية إسلامية ملتزم سلوكيا وأخلاقيا في كل حين لأنه يعلم أن الله يراقبه ومطلع على أعماله.

٨: تربية متطورة

التربية القرآنية الإسلامية تقوم على قيم عالية ومبادئ سامية وثابتة،ولكنها في نفس الوقت ليست جامدة،بل متطورة متجددة ، فهى مبنية على قول الحكمة ضالة المؤمن وهو أحق الناس بها والتربية الإسلامية قادرة على التعامل مع التكنولوجي الحديث المعاصر فهي تدعو إلى الاستفادة من كل ما يخدم هذا الدين ويفيد المسلمين .

المبحث الثاني: أهمية الشباب في المجتمع

المطلب الأول : مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام

مما لا يخفى أن المجتمع البشري مجموعة من الأفراد يتعايشون في اطار فيما بينهم في مختلف نواحي حياتهم ذاك المجتمع الذي يتشكل من افراد كل واحد منهم يعتبر فرداً مسؤولا عنه فكريا وسلوكيا وأمنيا وحضاريا. إن الإنسان لا يكون قويا عزيزا وفي منعة إلا إذا كان في أسرة تحصنة ضد الانحرافات الفكرية والأفعال غير السوية وتبين له ما فيه سعادته وفلاحه في هذه الحياة وتمنعه من الإنحراف والتمادي في الغوداية.

إن العلاقة بين الفرد والجماعة علاقة مصالح متبادلة ومشاركة ومقارنة لتلبية حاجة كل واحد لا علاقة حرب ونزاع. ان على كل احد منا أن ستوحي ان ما قام به النبي ﷺ أول قدومه المدينة من المؤاخاة بين المهاجرين والأنصار... من شأنها تقوية هذا البناء الاجتماعي وترسيخ مبداء الوحدة الاجتماعية بين افراده على كافة الإختلافات والتوجهات التى يفرزها الفكر البشري مع المحافظة على ثوابت الإسلام التي لا تقبل الجدال أو الاختلاف[١٩].

المسؤولية الاجتماعية ضرورة انسانية وقد كان الإسلام سباقا في تحديد عناصر مسؤولية المسلم الاجتماعية في هذه الحياة بما ووضع له من منهج قويم ينظم حركته فيها من اسس هذا المنهج ان يكون للفرد الدور الخلاق في المجتمع الذي يعيش فيه[٢٠]. فالرسول ﷺ فرض على كل فرد من افراد المجتمع المسؤولية يقول ﷺ ((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[٢١].

ثبت من ذلك أن كل فرد منا جزء من هذا المجتمع فعليه أن يحبه ويسعى إلى تقدمه ورفعته وأي لل فيه يؤثر سلبا على المجتمع ويقتضى الإسلام من جميع الأفراد والأسر وكافة المجتمع صغيرهم وكبيرهم رجالا ونساء التفكير الجاد نحو المسؤولية الإجتماعية.

إن تحقيق المسؤولية الاجتماعية يبدأ من البيت باعتبار أن الأسرة هي اللبنة الأولى في التربية ثم تتعضد مسؤولية البيت بالأعلام المرى والمسموع والمقروء وكذلك يقع على كاهل المدرسة مسؤولية كبرى في مناهجها واساتذتها كما أن على العلماء والوعاظ والمربين دوراً هاماً في هذا الجانب ، وأن كل أسرة لهادور كبير في تحقيق توجهات وتطلعات هذا المجتمع من الأمن ورغد العيش لأن الأسرة هي الدرع الحصينة لحماية أفرادها من الإنزلاق في المهادري.

فالرسولﷺ وسلم طلب من المؤمن أن يكون ايجابيا في مجمتمعه فهو يأمر بالمعروف وينهي عن المنكر ويشارك الناس كل مظاهر حياتهم .

المطلب الثاني: أهمية الشباب في المجتمع ومكانتها

في الحقيقة إن الشباب هو سن الهمم المتوثبة والدماء الفائرة والآمال العريضة سن العطاء والبذل والفداء سن التلقي والتأثر والإنفعال فالشباب رمز للقوة والبأس والحيوية والنشاط. ومن حقائق الحياة الثابتة أن فترة الشباب تعتبر عند الجميع الفترة التي تبلغ فيها ملكات وطاقات الإنسان الجسدية والعقلية والفكرية والمعنوية أقصى مستوى لها من النمو والإستعمال فهي الفترة التي يغرز فيها العقل امكاناته الإبداعية في أحسن صورها.

فالشباب هو القطاع المعتمد لدى كل الاتجاهات ذات الإستراتيجية التيغيرية ،فالثورات والانقلابات التي قامت وتقوم في شتى انحاء المعمورة التي قامت اعتمدت أساسا على الشباب في سبيل تحقيق أغراضها، ومن هنا نجد القرآن الكريم يصف هذه الفترة التي تبلغ فيها قدرات الإنسان أقصاها ويصبح فيه مؤهلا لتولى أقصى المسؤوليات وتلقي أشد الواجبات وكثير من الأنبياء ترلت عليهم الرسالة عندما بلغوا أشدهم .

في منطق الإسلام لا يعنى الاعتماد على الشباب اغفال دور الرجال والكهول أو إغماطهم حقهم أو الإقلال من شأنهم كما كان حال الشيوعية حين

طالب أحد زعمائها بعد الثورة بإبادة جميع المسنين حتى لا يكونوا كلا على الدولة. بل كل انسان له دوره وكل دور ينبغي أن يعطي حقه من غير حساسيات وبدون منازعات. من هنا كان الحرص على الاستفادة من سن الشباب ومن الشباب في تحقيق المهمات الصعبة ومواجهة التحديات.

والإسلام حين يحرص على الشباب في تحقيق اهدافه التغييرية فليس لكونه الجيل الذي لديه الصفات والمواصفات التجريدية فحسب وإنما يفرض.فوق ذلك وقبل ذلك.أن تتحقق في ذلك الجيل صفة الانتماء للإسلام والالتزام بمبادئه أي أن يكون جيلا مسلما لأن الشباب بالإسلام شيء وبغير الإسلام لا شيء.

الشباب هم الشريحة الأكثر أهمية وتأثيرا في أي مجتمع فإنهم عماد المستقبل و وسيلة التنمية وغايتها، و في صلاح الشباب صلاح للأمة ، وفي فسادهم فساد لها إلا ما شاء الله تعالى لأنهم هم القوة المتحركة في المجتمع. فالشباب يسهمون بدور فاعل في تشكيل ملامح الحاضر واستشراف آفاق المستقبل، والمجتمع لا يكون قويا إلا بشبابه ولذلك فان جميع الأمم والشعوب تراهن دورً على الشباب في كسب رهانات المستقبل لإدراكها بان الشباب هم العنصر الأساسي في تحويل الأمة وترقيتها والأوطان لا تبنى إلا بسواعد شبابها ، وعندما يكون الشباب معدا بشكل سليم وواعياً ومسلحاً بالعلم والمعرفة فانه سوف يصبح اكثر قدرة على مواجهة تحديات الحاضر واكثر استعدادا لخوض غمار المستقبل [٢٢].

وقد قدر الرسول ﷺ الشباب حق قدره وأبرز قيمته وأعلى شأنه كما روى عنه أنه قال((أن يغتنم المسلم من شبابه قبل شيخوخته))[٢٣]. وأنه ذكر من بين سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل إلا ظله شابا نشأ في طاعة الله[٢٤].كما روى عن الرسول ﷺ ((إن الله يعجب من الشاب الذي ليست له صبوة))[٢٥].

ونرى أيضا أن القرآن الكريم والرسول ﷺ يذكران أنه خلال تاريخ رسالات الله للبشر منذ عهد آدم حتى عهد محمد ﷺ كان الشباب هو الذي

اضطلع بالدور الأكبر والحاسم في اعلاء كلمة الله وشريعته.وذكر الله عز وجل في القرآن الكريم قصص كثيرة تخص الشباب وذلك لأهميتهم.

ويقول عبد الله بن عباس " إن الله لم يبعث رسولا إلا وكان شابا وما من عالم حصله علمه إلا في شبابه" (٢٦).

وهكذا تؤكد السيرة النبوية مدى اهتمام الرسولﷺ بالشباب اهتماما كبيراً فقد كان ﷺ يعتمد على الشباب فى نشر الدعوة فى بدايتها بمكة حيث أقام الدعوة فى دار أحد الشباب وهو ابن الأرقم ، ولا شك أن الدعوة تعتمد على العلم ونقل الوحي، فكان الشباب في ذاك الوقت هم نقلة هذا العلم إلى الناس. وكان ﷺ يوجه إرشاداته و تعليماته للشباب كما يعتمد ﷺ على الشباب ويسند إليهم مناصب والمسؤوليات كبيرة ،وهذا دليل على أن الشباب لهم الدور الأساسي في مسيره الرسالة الخالدة أن أصرار الرسول ﷺ على حماية الشباب الأكفاء والاعتماد عليهم كان له الأثر البالغ في أذهان عامة المسلمين .

إذن فالشباب في الإسلام له قيمة ومكانة لا يستهان بها، لأن الشباب طاقة الأمة، إذا ضيعت فقدت مقوماتها، و إذا حفظت بقيت للأمة مقوماتها وقوتها ومكانتها و مهابتها، و من هنا يجب العناية بالشباب من ناحية آبائهم، ومن ناحية المسؤولين، ومن ناحية عموم المجتمع، فيجب أن يتعاون المجتمع على توجيه الشباب نحو الخير، كل على حسب مسؤوليته.

المبحث الثالث: منهج القرآن في التربية الإيمانية للشباب

المطلب الأول : طرق وأساليب التربية القرآنية

عندما نمعن النظر في القرآن الكريم نجد الأساليب التربوية الكثيرة ومتعددة الأنماط والأشكال والتي تراعي أحوال الفئات المستهدفة وامكانياتهم وقدراتهم العلمية والإستيعابية و لها تأثير كبيراً في تربية الشباب وهي :

١- التربية بالقدو

٢- التربية بالموعظة

٣- التربية بالقصة الواقعية الهادفة

٤ _التربية بالملاحظة

٥- التربية بالعقوبة

التربية بالقدوة :

لا شك أ ن القدوة هي أفضل الوسائل المؤثرة في تربية الشباب، وقد نصب الله تعالى الصورة الكاملة للمنهج السليم القويم وهو شخصية نبينا محمد ﷺ ليسير الشباب علي منهجه حيث قال :﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾(٢٧).

وكان ﷺ مربياً وهادياً وأكبر قدوة للبشرية في العالم ، فينبغي أن نقدم قدوة نبينا محمد ﷺ أمام الشباب ليسيروا على نهجه في جميع أمور حياته .

التربية بالموعظة:

الموعظة البليغة لها أثر تربوي في نفوس الشباب وهى وسيلة مؤثرة في تكوين شخصية الشاب المسلم لإن الهدف من الموعظة أن يصل المربي بمن يعظه إلى الخشية الحقيقية من الله تعالى وأن يتذكر أمور الآخرة كأنها رأى العين، وهكذا كانت موعظة نبينا محمد ﷺ .

لاريب أن الموعظة الحسنة والنصيحة المؤثرة، إذا وجد ت لها نفساً صافية، وعقلاً سليما و قلباً متفتحاً ، فإنها أبلغ في التأثيروأسرع للاستجابة . والقرآن الكريم مملؤء بالآيات التي تتخذ أسلوب الوعظ أساساً لمنهج الدعوة طريقاً للوصول لإصلاح الناس وهدايتهم فالقرآن كله مواعظ للمتقين ،كما قال تعالى:﴿ هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ﴾(٢٨).

التربية بالقصة:

وللقصة دوركبير في تحريك العقول للتفكر ، والوصول إلى الحقيقة وتجسيدها في ممارسات ومواقف عملية ، فمن وسائل التربية المؤثرة في تكوين شخصيه الشاب، تربيته بالقصص الهادفة وهي من أهم وسائل التربية لأن النفس البشرية تميل إلى الأسلوب القصصي، والقرآن يستخدم القصة لجميع أنواع التربية والتوجيه، التي يشملها منهجه التربوي اى تربية العقل والجسم والروح ،لترسيخ المعاني الإيمانية وغرس الفضائل في نفوس الشاب قد ذكر الله تعالى كثيراً من القصص في القرآن الكريم من أجل تربية الناس.قال الله تعالى: ﴿ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾(٢٩).

التربية بالمراقبة:

القرآن الكريم حث الوالدين والمربين، جميعاً علي أن يهتموا بمراقبة أبنائهم من جميع الجوانب.فالمقصود بالمراقبة مراقبة الأبناء، و ملاحظة تصرفاتهم ، قال سبحانه: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾(٣٠).

ولا يمكن أن يقي الوالدان أولادهم من جهنم، إذا لم يأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر، ولم يراقبهم اذا من واجبات الوالدين والمربين إذا رأوا من أبنائهم منكراً نهوهم عنه، وإذا فعلوا معروفاً شكروهم عليه و إذا أهملوا حقاً من حقوق الله، أرشدوهم إليه، وإذا قصروا في واجب نصحوهم .لا شك أن هذه الوسيلة من التربية تعتبر من أقوي الأسس في إعداد الشاب المتوازن، الذي يستطيع أن يقوم بمسئولياته نحو مجتمعة علي الوجه التام .

التربية بالعقوبة:

حين لا تفلح التربية بالقدوة ولا الموعظة، فلا بد من علاج حاسم يضع الأمور في وضعها الصحيح، والعلاج الحاسم هو العقوبة، إن العقوبة ليست ضرورة

لكل شخص، فقد يستغني شخص بالقدوة، وبالموعظة، فلا يحتاج في حياته كلها إلى عقاب، ولكن الناس ليسوا سواء في ذلك، ففيهم من يحتاج إلى العقاب مرة، أو ومرات عديدة، وليست العقوبة هي أول ما يأتي على عقل المربي ولكن الموعظة هي الأصل مع الصبر الجميل،لعل هذا الشاب يعود إلى صوابه[٣١].

الإسلام يستخدم التخويف والترهيب بجميع درجاته من أول التهديد إلى التنفيذ .فإذا رأى الوالد أن ولده قد صلح حاله بعد العقوبة، واستقام سلوكه، فعليه أن يتلطف معه ويوضح له أنه ما قصد من العقوبة إلا مصلحته في الدنيا والآخرة[٣٢].

المطلب الثانى :جوانب التربية الإسلامية في القرآن

لقد ذكر الله تعالي في كتابه الحكيم أمثلة الشباب الذين تربوا علي منهج القرآن فكانوا مشاعل ضياء في مجتمعاتهم المنحرفة والقدوة الكريمة التي يقتدي بها و يعطينا القرآن الكريم أمثله عملية وصورة مختلفة من منهجه في تربية الشباب فنرى عرض القرآن الكريم البليغ الممتلىء بالإشارات والتوجيهات من هذه القصص الرائعة.

١:قصة سيدنا لقمان الحكيم:

يعرض علينا القرآن صورة جذابة رائعة موقف الأب وهو لقمان الذي ينصح ابنه ويرشده ويهديه، قال تعالى: ﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِه وَهُوَ يَعِظُه يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ....اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾[٣٣].

فهذه وصية جامعة اشتملت على العقيدة والسلوك والعمل فيها التنزه عن الأشراك بالله و الثقة بكمال قدرته و علمه. والأمر بأقامة الصلاة تحقيقا للصلة بين العبد و ربه والشكر لله وللوالدين والإحسان لهم.وفيها الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر والصبر على ما يصيب الأنسان في ماله أو نفسه أو ولده ،والقصد في المشي

بحيث يكون الإنسان معتدلا في سيره وسلوكه وعدم التعنط في معاملة الناس وعدم الكبر والخيلاء وعدم رفع الصوت وازعاج الناس.

وهذه صورة جامعة من التأديب والتهذيب يعرضها القرآن ليغري بها الشباب ولتكون للأباء نموذجا ومثالا يحتذونه.

٢:قصة يوسف بن يعقوب عليهما السلام

إن شخصية الصديق يوسف عليه السلام تُعد مثلاً تربويًا وأنموذجًا رائعًا للشاب المسلم الصابر ، المتعالي على الشهوات،والمترفع عن إغراءات الشيطان في مختلف شؤون حياته ،تربى يوسف نبى الله عليه السلام في بيت عزيز مصر حتى إذا أصبح شاباً يافعاً ابتلاه الله تعالى بامرأة العزيز في مجتمع اعتاد على الرذيلة، لا يعرف معروفاً ولا ينكر منكراً فاستعان بالله عليها ورد الله كيدها في نحرها وعصم الله تعالى يوسف الصديق من الفتن. يقول الله تعالى عن يوسف عليه السلام:

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴾[٣٤]

ومن خلال هذه القصة التربوية الرائعة و التي وصفها القرآن الكريم بأنها أحسن القصص نستنبط العديد من الدروس والعبر والعظات كما نرى جوانب إيجابية وأُخرى سلبية في حياة الإنسان وأخلاقه وتصرفاته.

٣:قصة ابراهيم عليه السلام:

صورة أخرى يتغير فيها موقف الأب والأبن فيكون الأبن هو الذي ينصح أباه ونرى فيها مناشدة قوية مهذبة رائعة.فنبي الله ابراهيم عليه السلام فتى في ريعان الشباب يحطم الأصنام ويجادل من يعبدونها ومن بينهم أبوه ءازَرَ بأسلوب حكيم قال تعالى:﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا....إلى قوله يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا﴾[٣٥].

إن هذه المناشدة تقوم على أساس متين من الإيمان العميق والأدب العالي ومن القوة الخلقية وكل جملة من جملها تحمل توجيها قويا ومعاني شريفة وهذا مثال رائع واسلوب حكيم في الدعوة إلي الله.

٤: قصة فتية أهل الكهف:

انها صورة فتية الكهف ذكرهم الله تعالى في محكم تنزيله وربط على قلوبهم بالعزيمة الصادقة التي لا تتزلزل ولا يضعف أصحابها،جعلهم الله قدوة و نبراساً لمن يعيش في مجتمعٍ يموجُ بالعقيدة الباطلة والمعاصي والذنوب.يقول سبحانه: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى﴾[٣٦].

الذين آمنوا بربهم واعتزالوا عن أهل الباطل وتركوا بيوتهم وفضلوا عليها سكنى الجبال والكهوف تلك أوصاف فتية الكهف الذين صور الله لنا أمرهم بهذه الصورة الرائعة من اعتناق القيم والأيمان بالمثل .

فهذه القصص هى اللبنة القوية الصالحة التى يقوم عليها المجتمع الصالح وبهم تكون قوة الأمة وعزيمتها ويكون صلاح أمر الإسلام .

الخاتمة :التوصيات والمقترحات

الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، أحمد لله تعالى على توفيقه وامتنانه، على كتابة هذا البحث المتواضع بعنوان " منهج القرآن الكريم في تربية الشباب" فله الحمد أولا وآخرا. وفيما يلي أشير إلى أهم التوصيات والمقترحات التي توصلت إليها من خلال دراسة هذا الموضوع، يمكن الإستفادة من هذا المنهج القويم في تربية الشباب بعدة أمورهي:

١ : الإستنارة من منهج القرآن الكريم في تربية الشباب

٢: متابعة الجهود في تأصيل القيم القرآنية والنشاطات الإسلامية الثقافية المنبثقة من تعليم الإسلام

٣: يجب علماء الأمة وعلى رأسهم الوالدين والمربيين أن يربوا أولادهم وفق نهج القرآن والسنة ليواجهوا الحياة بابتسامة متفائلة،وعزيمة جبارة ليكونوا شباب الغد، ورجال المستقبل

٤: وهكذا يجب على الوالدين والمربين أن يكونوا قدوة حسنة لأولادهم

٥: توفير البيئة الأخلاقية والمعنوية والثقافية المناسبة والمنبثقة من الكتاب والسنة

٦: إصلاح المناهج التعليمية التي يتلقونها في الجامعات و المدارس

٧: السعي الجاد باختيار الأساتذة الأكفاءلتعليم أبنائهم الشباب

٨: توفير البيئة الأخلاقية والمعنوية والثقافية المناسبة في ضوء الكتاب والسنة

٩: السعي لتأمين الاحتياجات الأساسية للشباب

١٠: مشاركة الشباب في الشؤون المجتمع الكاملة ،السياسية والاقتصادية والثقافية

١١: التقاء الشباب بالعلماء من خلال ندوات في المساجد وفي المدارس وفي غيرها

١٢: تأييد الدور الهام لوسائل الإعلام في تعليم الجيل الشاب ورعايته

١٣: توجيه الشباب لاغتنام الفرص للعمل الصالح

الهوامش والإحالات

١) سورة البقرة: ٢٧٦

٢) سورة الإسراء : ٢٤

٣) لسان العرب لإبن منظور ، ص: ٣٥٦٣

٤) المفردات في غريب القرآن للإمام الراغب الأصفهاني ، ص: ١٤٨

٥) انوار التنزيل واسرار التأويل للإمام البيضاوي ،ص : ٧

٦) السياسة لإبن سينا ص: ٧

٧) المقدمة لإبن خلدون ،ص :٤١٠

٨) مسند أحمد للإمام احمد ،ص: ٧ / ٤٨ رقم الحديث (٢٠٩٧٠) (٢١٢٧٩) و فيه ضعف

٩) سورة هود: ٨٨

١٠) سورةالشمس: ٩

١١) تفسير السعدى ص:٩٢٦

١٢) سورة البقرة :١٢٩

١٣) سورة الزخرف: ١٨

١٤) سورة الأنعام:١٥٣

١٥) رسالة الولد للإمام الغزالي ،ص:٦

١٦) سورة الشمس:٩- ١٠

١٧) سورة النجم:٣٩ - ٤١

١٨) سورة ق: ١٦

١٩) الأسرة في ضوء الكتاب والسنة ، ص :٦

٢٠) المنهاج النبوي في دعوة الشباب ، ص:٧١

٢١) الجامع الصحيح للإمام البخارى ، كتاب العتق ، باب كراهية التطاول على الرفيق ، رقم الحديث:٢٥١٧.

٢٢) دراسة مقارنة للحضارة الإسلامية والحضارة الغربية المادية ودور الشباب المسلم للدكتور محمد منظور عالم ،ص:٢٩.

٢٣) المستدرك للحاكم ، ص:٣/٧٨٤٦

٢٤) الجامع الصحيح ، كتاب الزكوة ، باب الصدقة اليمين ، رقم الحديث : ١٤٢٣

٢٥) مسند أحمد ، ٤/١٥١، رقم الحديث ١٧٣٧١

٢٦) كتاب السنة لابن أبي عاصم ، ١/٢٥٠، رقم الحديث: ٥٧١

٢٧) سورة الأحزاب:٢١

٢٨) سورة آل عمران:١٣٨

٢٩) سورة يوسف:١١١

٣٠) سورة التحريم: ٦

٣١) منهج التربية لمحمد قطب ص:١ /٢٠٠

٣٢) تربية الأولاد لعبد الله ناصح ص:٢ /٦٩٨

٣٣) سورة لقمان :١٣-١٨

٣٤) سورة يوسف: ٣٤

٣٥) سورة مريم: ٤٥

٣٦) سورة الكهف: ١٣

المصادر والمراجع

١) القرآن الكريم

٢) الأسرة في ضوء الكتاب والسنة :د/ السيد أحمد فرج، الطبعة الأولى، ١٤٠٧هـ طبع دارالوفاء مصر

٣) أصول الفكر التربوي في الإسلام : د/ عباس محجوب ، الطبعة الأولى ١٤٠٨ هـ صححه: خير أحمد العطار ، مؤسسة علوم القرآن عجمان ، ودار ابن كثير ، دمشق ، بيروت

٤) انوار التنزيل واسرا رالتأويل للإمام البيضاوي، دار الفكر

٥) بناء المجتمع الإسلامي ونظمه : دراسة في علم الاجتماع الإسلامي ، د/ نبيل السمالوطيالطبعة الثالثة ١٤١٨ هـ دار الشروق ، السعودية

٦) تربية الأبناء والبنات في ضوء القرآن والسنة : إعداد وتصنيف الشيخ / خالد عبد الرحمن العلك، دار المعرفة ، بيروت

٧) التربية الإسلامية وأشهر المربين المسلمين : د/ محمد علي محمد المرصفي ، و د/آمال حمزة المرزوقي أبو حسين ، الطبعة الأولى ١٤١٠ هـ

٨) التربية الإسلامية والطبيعة الإنسانية : الأستاذ الدكتور مقداد بالجن ، الطبعة الأولى ١٤١٨ هـ دار عالم الكتب ، الرياض

٩) تربية الأطفال في رحاب الإسلام في البت والروضة : محمد حامد الناصر، خولة عبد القادر درويش، الطبعة الأولى ١٤١١هـ نشر : مكتبة الوادي ، جده .

١٠) تربية الأولاد لعبد الله ناصح، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ دار القلم ، دمشق ، الدار الشامية بيروت

١١) تفسير القرآن العظيم : عز الدين بن عبد السلام (ت٦٦٠هـ) تقديم : د/ عبد الله الوهيبي،الطبعة الأولى ١٤١٦ هـ السعودية .

١٢) تيسير الكريم الرحمن في تفسير الكلام المنان : عبد الرحمن بن ناصر السعدي، المطبعة السلفية، مصر

١٣) جمهرة الأمثال : أبو هلال الحسن بن سهل العسكري (ت ٣٩٥هـ) تحقيق : د/ أحمد عبد السلام ، وأبو طاهر محمد سعيد بيسوني زغلول ، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ دار الكتب العلمية ،بيروت

١٤) دراسة مقارنة للحضارة الإسلامية والحضارة الغربية المادية ودور الشباب المسلم للدكتور محمد منظور عالم، دار الكتب العلمية ، بيروت

١٥) رسالة الولد للإمام الغزالي ، الطبعة الأولى ، دار الفكر العربي ، القاهرة ١٩٨٢

١٦) السلوك الاجتماعي في الإسلام : حسن أيوب ، طبع دار الندوة الجديدة ، بيروت

١٧) السياسة لإبن سينا ص: ٧ ،مؤسسة شباب الجامعة – الإسكندرية

١٨) الشباب والتغير للدكتور فتحي ' أبحاث ووقائع اللقاء الرابع للندوة العالمية للشباب الإسلامي مارس ١٩٧٩ ' مبطع ثاني الرياض.

١٩) الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية : إسماعيل بن حماد الجوهري ، تحيق: أحمد عبد الغفور عطار،

طبع سنة١٤٠٢ هـ .

٢٠) صحيح البخاري : محمد بن إسماعيل البخاري (ت ٢٥٦هـ) مع شرحه فتح الباري لابن حجر، ترقيم: محمد فؤاد عبد الباقي ، تصحيح وإخراج :محب الدين الخطيب ، وراجعه: قصي محب الدين الخطيب ، الطبعة الثانية ١٤٠٧ هـ دار الريان للتراث، القاهرة

٢١) في ظلال القرآن : سيد قطب ، طبع سنة ١٣٩٤هـ درا الشروق

٢٢) القاموس المحيط : مجد الدين محمد بن يعقوب الفيروز آبادي (ت٨١٧هـ) تحقيق :مكت تحقيق التراث في مؤسسة الرسالة ، الطبعة الثانية ١٤٠٧هـ مؤسسة الرسالة ، بيروت

٢٣) كتاب السنة لابن أبي عاصم ،دار الفكر ، بيروت

٢٤) لسان العرب لإبن منظور ، دار المعارف ،الطبعة الأولى

٢٥) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد : نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي (ت ٨٠٧هـ) بتحرير الحافظين :العراقي وابن حجر، طبع سنة ١٤٠٨هـ دار الكتب العلمية ، بيروت

٢٦) مختار الصحاح : أبو بكر بن عبد القادر الرازي ،الطبعة الثالثة ١٤١٨هـ اعتنى بها: الأستاذ يوسف الشيخ محمد ، المكتبة العصرية ، بيروت

٢٧) مدخل إلى أصول التربية الإسلامية : د/ محمد عبد الرحمن فهد الدخيل ، الطبعة الأولى ١٤١٨ هـ صف بمركز طيبة للطباعة بالمدينة المنورة

٢٨) المستدرك على الصحيحين : أبو عبد الله محمد بن عبد الله الحاكم النيسابوري ، مع تضمينات الإمام الذهبي في التلخيص والميزان والعراقي في أماليه، والمناوي في فيض القدير تحقيق:مصطفى عبد القادر عطا،الطبعة الأولى ١٤١١هـ دار الكتب العلمية ، بيروت

٢٩) المسند :أحمد بن حنبل (ت ٢٤١هـ) وبهامشه منتخب كنز العمال بدون رقم وتاريخ الطبعة ، المكتب الإسلامي بيروت . والنسخة الثانية: بتحقيق : شعيب الأرنؤوط وزملاؤه ، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ مؤسسة الرسالة ، بيروت

٣٠) المصباح المنير في غريب الشرح الكبير للرافعي : أحمد بن محمد بن علي الفيومي (ت ٧٧٠ هـ) الطبعة الأولى ١٤١٤هـ دار الكتب العلمية ، بيروت

٣١) المفردات في غريب القرآن للإمام الراغب الأصفهاني ، دار القلم ، دمشق

٣٢) المقدمة لإبن خلدون ،: درا الكتاب العربي ، بيروت

٣٣) المنهاج النبوي في دعوة الشباب:سليمان بن قاسم ، الطبعة الأولى، ١٤١٥هـ دارالعاصمة، الرياض

٣٤) منج التربية الإسلامية ،محمد قطب ، دار الشروق ، الرياض

٣٥) منهج المؤمن بين العلم والتطبيق : د/ عدنان علي رضا النحوي الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ والثانية ١٤٠٨هـ دار النحوى للنشر ، الرياض

****

الأخبار الموضوعة في سنن ابن ماجه،دراسة نقدية

The critical analysis of fabricated Ahadiths in Sunan Ibn-e-Maja

الدكتور فتح الرحمن القرشي*

ABSTRACT

The scholars of Hadith gave special attention to the fabricated hadith and they explained it to others and warned about its danger. They all agreed upon it that transmission of fabricated report is unlawful only one way is lawful if the status of this report is narrated with its transmission. Some great scholars of hadith like Mizzi, Zahabi and Ibn Hajr have pointed out that in the sunan of Ibn Maja there are some fabricated and false ahadith.

I took interest in study of these fabricated ahadith and I separated them and studied these ahadith according to the Principles of research of this filed. You will find during the study of this paper the importance of Sunan among the six books. You will study comments of scholars about this book. After complete study of this paper, we can conclude following points:

1. There are forty-four fabricated ahadith in Sunan of Ibn Maja.
2. These ahadith are found in five books except one, hadith is narrated by only Ibn Maja.
3. Ibn Maja declared about only one hadith that it is baseless.
4. Ibn Juzi mentioned only seven ahadith in his book fabricated ahadith.
5. Imam Bausairi showed indefference in commenting and declaring these ahadith as fabricated in his book Misbah-uz-zujazah. Although there are clear signs of fabrication in these ahadith.

Keywords: fabricated hadith, Ibn Maja, signs of fabrication, scholars, transmission

* أستاذ مساعد بكلية أصول الدين،الجامعة الإسلامية العالمية، إسلام آباد

مدخل: للمحدثين اهتمام خاص بما يتعلق بالخبر الموضوع والكشف عنه، وبيان خطره، والتحذير منه، ويتضح ذلك جليًّا في كتبهم التي وضعوها لبيان الأحاديث الضعيفة والموضوعة؛ إذ ضمَّنوها جملة من الضوابط التي يعرف بها كون الحديث موضوعاً، مع التنبيه على الكثير من الأحاديث الموضوعة، وبيان حالها، وذكر المتَّهم بها، وبيان مراتبها. وأدخلوا فيه ما الأكثرون على أنه موضوع، والآخرون يقولون: هو حديثٌ ساقطٌ مطروح، ولا نجسرُ أن نسمِّيه موضوعاً. ومنه: ما الجمهور على وَهْنِه وسُقوطه، والبعضُ على أنه كذب[1]

ويدخل فيه قولهم: "حديث لا أصل له"، أرادوا: لا أصل له عمن أضيف إليه من ذلك الطريق، وقد يكون أصله محفوظ عن النبي ﷺ من غير ذلك الوجه، مثاله حديث رواه نوح بن حبيب، عن عبد المجيد بن عبد العزيز بن أبي رواد، عن مالك بن أنس، عن زيد بن أسلم، عن عطاء بن يسار، عن أبي سعيد الخدري، عن النبي ﷺ: "إنما الأعمال بالنيات"[2]، سُئِل عنه أبو حاتم الرازي فقال: "هذا حديث باطل، لا أصل له، إنما هو: مالك، عن يحيى بن سعيد، عن محمد بن إبراهيم التيمي، عن علقمة بن وقاص، عن عمر، عن النبي ﷺ"[3].

قد أجمع العلماء من المحدثين وغيرهم على عدم جواز رواية الموضوع ونسبته إلى النبي ﷺ إلاّ مقروناً ببيان وضعه[4].قال السيوطي: "وقد أطبق على ذلك علماء الحديث فجزموا بأنه لا تحل رواية الموضوع في أي معنى كان الا مقروناً ببيان وضعه"[5].

فبالنظر إلى المراتب التي أنزل فيها العلماء الأحاديث التي حكموا بوضعها وجعلوها تحت مسمى "الموضوع"، وللطرق التي اتبعوها للكشف عن الخبر الموضوع، وعلامات تمييزه، والكلام على الكذّابين والوضّاعين، والكتب المؤلفة في تمييز الأحاديث الموضوعة؛ يمكن أن نعرِّف الخبر الموضوع بأنه: "هو الكذب على رسول الله ﷺ المختلق، المصنوع[6] – أي: أن واضعه اختلقه وصنعه[7] – رُكِب له إسناد

أو جاء بغير إسناد، أو قام دليل على أنه باطل، وإن كان المحدّث به لم يتعمَّد الكذب، بل غلط فيه. وهو شرُّ أنواعِ الضعيف[٨]،لا تحل روايته في أي معنى كان الا مقروناً ببيان وضعه، ويحرم التساهل فيه سواء كان في الأحكام والقصص أو الترغيب والترهيب أو غير ذلك[٩].

تجد في ثنايا هذا البحث، شيئاً يسيراً عن مكانة سنن ابن ماجه بين الكتب الستة، وبعض أقوال العلماء حول هذا الكتاب العظيم، وعن زوائده على الكتب الخمسة. والدراسة التفصيلية للأخبار الموضوعة محل النظر، وفي الخاتمة أهم نتائج إن شاء الله.

أولاً: مكانة سنن ابن ماجه بين الكتب الستة:

كان المتقدمون يعدون الكتب الأصول خمسة: الصحيحين وسنن أبي داود، والترمذي، والنسائي، ثم أُلحق كتاب ابن ماجه بالكتب الخمسة، لما فيه من الفقه وحسن الترتيب، ولما فيه من الزوائد على الكتب الخمسة الأصول، فأصبحت تعرف بالكتب الستة، وكان ذلك على يد محمد بن طاهر المقدسي (ت٥٠٧هـ)، صاحب كتاب (شروط الأئمة الستة). وسار على منواله الحافظ عبد الغني بن عبد الواحد المقدسي المتوفى في سنة ٦٠٠هـ، فضمن كتابه (الكمال في أسماء الرجال)، رجال ابن ماجه كأحد الستة، ثم درج على هذا أصحاب كتب الأطراف وكتب الرجال.

ومن العلماء من جعل سادس الأصول الستة: (موطأ الإمام مالك) لقوة أحاديثه، بينما يرى ابن حجر أن الأولى بذلك (سنن الدارمي) لقلة الرجال الضعفاء فيه، ولندرة الأحاديث الشاذة والمنكرة.وقد قدّم (الموطأ) على (سنن ابن ماجه) أبو السعادات مبارك بن محمد المعروف بابن الأثير الجزري المتوفى

(ت٦٠٦هـ)، وغيره. ومن المعروف أن علماء المغرب يقدمون كتاب (الموطأ) على بعض الصحاح.

ومرجع تقديم كتاب (سنن ابن ماجه) على كتاب (الموطأ) للإمام مالك، وجعله أحد الكتب الستة، يرجع إلى أن زوائد ابن ماجه على الكتب الخمسة كثيرة، بينما نجد أحاديث الموطأ موجودة في الكتب الخمسة.

ثانياً: أقوال أهل العلم في سنن ابن ماجه:

كان ابن ماجه حافظاً ناقداً صادقاً، واسع العلم، وإنما غض من رتبة (سننه) ما في الكتاب من المناكير، وقليل من الموضوعات. قال ابن حجر: "كتابه في السنن، جامع جيّد كثير الأبواب والغرائب، وفيه أحاديث ضعيفة جداً حتى بلغني أن السري كان يقول: مهما انفرد بخبر فيه هو ضعيف غالباً. وليس الأمر في ذلك على إطلاقه باستقرائي[١٠]. وفي الجملة ففيه أحاديث منكرة، والله تعالى المستعان. ثم وجدت بخط الحافظ شمس الدين محمد بن علي الحسيني ما لفظه: سمعت شيخنا الحافظ أبا الحجاج المزي يقول: كل ما انفرد به بن ماجة فهو ضعيف. يعني بذلك: ما انفرد به من الحديث عن الأئمة الخمسة. انتهى ما وجدته بخطه"[١١]. ثمّ تعقبه بقوله: " لكن حمله على الرجال أولى. وأمّا حمله على الأحاديث، فلا يصح"[١٢].

ثالثاً: زوائد سنن ابن ماجه على الكتب الخمسة:

الزوائد هي الأحاديث الزائدة في مصنف رويت فيه الأحاديث بأسانيد مؤلفه، على أحاديث كتب الأصول الستة أو بعضها من حديث بتمامه لا يوجد في الكتب المزيد عليها، أو هو فيها عن صحابي آخر، أو من حديث شارك فيه أصحاب الكتب المزيد عليها أو بعضهم، وفيه زيادة مؤثرة عنده[١٣]. وهذه الزيادة مطلقة. وقد تكون في سند أو متن حديث اشتركا في إخراجه وهذه الزيادة نسبية.

وقد حاول جمعٌ من العلماء عدّ زوائد ابن ماجه على الكتب الخمسة، على اختلاف بينهم في العدّ وكيفيته، والذي أميل إليه هو ما ذهب إليه محققو سنن ابن ماجه: شعيب الأرناؤط، وعادل مرشد، ومحمد كامل، وعبد اللطيف حرز الله، حيث قالوا: "تبين لنا أن الإمام ابن ماجه انفرد من بين أصحاب الكتب الخمسة بثلاثة عشر ومائتين وألف حديثاً بالمكرر"(١٤).

وقد ظهر من خلال الإحصاء الذي قاموا به، "أن مجموع الأحاديث الصحيحة والحسنة لذاتها ولغيرها التي انفرد بها ابن ماجه عن الكتب الخمسة بلغت ستمائة حديث وهي تساوي نصف ما انفرد به تقريباً ... ومنها أربعةٌ وثمانون ومائة حديثاً هي ضعيفة جدا" (١٥).

وقد ذكر أهل العلم أن ابن ماجه تفرد في سننه بجملة أحاديث عن رجال متهمين بالكذب وسرقة الأحاديث، حكم عليها الأئمة بالبطلان والوضع. أدرج منها العلامة ابن الجوزي في كتابه الموضوعات أربعة وثلاثين حديثاً، وقد نُوزع في غير حديث منها، كما هو بيِّن في تعليقات السيوطي عليه في كتاب: "اللآلىء المصنوعة في الأحاديث الموضوعة".

رابعاً: الأخبار الموضوعة في سنن ابن ماجه:

احتفظتُ في هذا البحث بعنوان الكتاب، والباب، ورقم الحديث، من طبعة دار إحياء الكتب العربية – فيصل عيسى البابي الحلبي، وترقيم محمد فؤاد عبد الباقي، لانتشار ذلك، وسهولة الرجوع إليه. وجعلتُ لي ترقيماً خاصّاً متسلسلاً جعلته بين قوسين. والآن إلى موضوع البحث، فأقول وبالله التوفيق:

(١) - ٤٩- حَدَّثَنَا دَاوُدُ بْنُ سُلَيْمَانَ الْعَسْكَرِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ أَبُو هَاشِمِ بْنِ أَبِي خِدَاشٍ الْمَوْصِلِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مِحْصَنٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ أَبِي عَبْلَةَ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الدَّيْلَمِيِّ، عَنْ حُذَيْفَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ: «لَا يَقْبَلُ اللَّهُ لِصَاحِبِ بِدْعَةٍ صَوْمًا، وَلَا صَلَاةً، وَلَا صَدَقَةً، وَلَا حَجًّا، وَلَا عُمْرَةً، وَلَا جِهَادًا، وَلَا صَرْفًا، وَلَا عَدْلًا، يَخْرُجُ مِنَ الْإِسْلَامِ كَمَا تَخْرُجُ الشَّعَرَةُ مِنَ الْعَجِينِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٦).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته محمد بن محصن العكّاشي وهو: محمد بن إسحاق بن إبراهيم بن محمد بن عكاشة أبو محصن الأسدي(١٧). "قال يحيى وأبو حاتم الرازي: كذاب. وقال البخاري: منكر الحديث. وقال ابن عدي: يروي عن الأوزاعي أحاديث مناكير موضوعة. قال الدراقطني: يضع الحديث. وقال ابن حبان: يروي المقلوبات لا يكتب حديثه إلا للاعتبار"(١٨). وروى له ابن عدي عدّة أحاديث وقال: "كلها مناكير موضوعة"(١٩).

(٢) - ٥٥ - حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ حَمَّادٍ سَجَّادَةُ، حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأُمَوِيُّ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سَعِيدِ بْنِ حَسَّانَ، عَنْ عُبَادَةَ بْنِ نُسَيٍّ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ غَنْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ، قَالَ: " لَمَّا بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ قَالَ: «لَا تَقْضِيَنَّ وَلَا تَفْصِلَنَّ إِلَّا بِمَا تَعْلَمُ، وإِنْ أَشْكَلَ عَلَيْكَ أَمْرٌ، فَقِفْ حَتَّى تَبَيَّنَهُ أَوْ تَكْتُبَ إِلَيَّ فِيهِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(٢٠).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته الزنديق محمد بن سعيد بن حسان بن قيس القرشي الأسدي المصلوب(٢١)، كان يضع الحديث عمداً(٢٢)، صلبه المنصور على الزندقة، وضع أربعة آلاف حديث، قلبوا اسمه على مائة وجه ليخفى(٢٣)! قال ابن حبان: "يضع الحديث على الثقات ويروي عن الأثبات ما لا أصل له لا يحل ذكره في الكتب إلا على سبيل القدح فيه ولا الرواية عنه بحال من الأحوال"(٢٤).

(٣) - ٦٥ - حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ أَبِي سَهْلٍ، وَمُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، قَالَا: حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ صَالِحٍ أَبُو الصَّلْتِ الْهَرَوِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُوسَى الرِّضَا،

عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْإِيمَانُ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ، وَقَوْلٌ بِاللِّسَانِ، وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ» قَالَ: أَبُو الصَّلْتِ: لَوْ قُرِئَ هَذَا الْإِسْنَادُ عَلَى مَجْنُونٍ لَبَرَأَ. ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "أبو الصلت هذا متفق على ضعفه واتهمه بعضهم. تابعه محمد بن سهل بن عامر البجلي، ومحمد بن زياد السلمي عن علي بن موسى الرضا"(٢٥).

قلتُ: هذا إسناد موضوع: آفته عبد السلام بن صالح بن سليمان أبو الصلت الهروي، أحد الروافض الكذّابين، قال الذهبي في الضعفاء: "اتهمه بالكذب غير واحد، قال أبو زرعة: لم يكن بثقة. وقال ابن عدي: متهم. وقال غيره: رافضي. وفي التقريب: "صدوق، له مناكير، وكان يتشيع، وأفرط العقيلي فقال: كذاب". قال الألباني: "لم ينفرد بذلك العقيلي، بل تابعه محمد بن طاهر، فقال أيضا: "كذاب"؛ كما نقله الحافظ نفسه في "التهذيب". وذكر فيه عن أبي الحسن – وهو الدارقطني –: "وهو متهم بوضعه – يعني هذا الحديث – لم يحدث به إلا من سرقه منه، فهو الابتداء في هذا الحديث"(٢٦). وهذا الحديث معروف في كتب الموضوعات(٢٧).

(٤) - ١٤١ – حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ الضَّحَّاكِ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَيَّاشٍ، عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ، عَنْ كَثِيرِ بْنِ مُرَّةَ الْحَضْرَمِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ اتَّخَذَنِي خَلِيلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا، فَمَنْزِلِي وَمَنْزِلُ إِبْرَاهِيمَ فِي الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُجَاهَيْنِ، وَالْعَبَّاسُ بَيْنَنَا مُؤْمِنٌ بَيْنَ خَلِيلَيْنِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(٢٨).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته شيخ ابن ماجه عبد الوهاب بن الضحاك بن أبان السلمي(٢٩). متروك الحديث(٣٠). قال أبو حاتم: "حدث بأحاديث كثيرة

موضوعة، فخرجت إليه فقلتُ: ألا تخاف الله عز وجل؟ فضمن لى أن لا يحدث بها، فحدث بها بعد ذلك"[٣١]. و"قال الأزدي: كان يكذب. وقال العقيلي والنسائي: متروك الحديث. وقال ابن حبان: كان يسرق الحديث لا يحل الاحتجاج به. وقال الدارقطني: منكر الحديث"[٣٢].

(٥) - ٢٢٢ - **حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الْوَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا رَوْحُ بْنُ جَنَاحٍ أَبُو سَعْدٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ». أخرجه الترمذي** (٤٨/٥) (٢٦٨١) قال حدَّثنا محمَّد بن إسماعيل: حدَّثنا إبراهيم بن موسى، حدثنا الوليد بن مسلم[٣٣].

قلتُ: هذا إسناد موضوع: آفته روح بن جناح القرشي الأموي[٣٤]. قال أبو حاتم الرازي: "أخوه مروان بن جناح أحب إلي منه، يكتب حديثهما ولا يحتج بهما"[٣٥]. وقال النسائي: "ليس بالقوي"[٣٦]. وقال ابن حبان: "منكر الحديث جداً يروي عن الثقات ما إذا سمعها الإنسان الذي ليس بالمتبحر في صناعة الحديث شهد لها بالوضع!" [٣٧].

(٦) - ٢٤٨ - **حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَامِرِ بْنِ زُرَارَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا الْمُعَلَّى بْنُ هِلَالٍ، عَنْ إِسْمَاعِيلَ، قَالَ: دَخَلْنَا عَلَى الْحَسَنِ نَعُودُهُ حَتَّى مَلَأْنَا الْبَيْتَ، فَقَبَضَ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: دَخَلْنَا عَلَى أَبِي هُرَيْرَةَ نَعُودُهُ حَتَّى مَلَأْنَا الْبَيْتَ، فَقَبَضَ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: دَخَلْنَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَتَّى مَلَأْنَا الْبَيْتَ وَهُوَ مُضْطَجِعٌ لِجَنْبِهِ، فَلَمَّا رَآنَا قَبَضَ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّهُ سَيَأْتِيكُمْ أَقْوَامٌ مِنْ بَعْدِي يَطْلُبُونَ الْعِلْمَ، فَرَحِّبُوا بِهِمْ، وَحَيُّوهُمْ، وَعَلِّمُوهُمْ»، قَالَ: «فَأَدْرَكْنَا وَاللَّهِ أَقْوَامًا مَا رَحَّبُوا بِنَا، وَلَا حَيَّوْنَا، وَلَا عَلَّمُونَا، إِلَّا بَعْدَ أَنْ كُنَّا نَذْهَبُ إِلَيْهِمْ فَيَجْفُونَا». ذكره البوصيري في الزوائد،** وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٣٨].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته معلى بن هلال بن سويد أبو عبد الله الطحان الكوفي[٣٩]. "كان يضع الحديث وقال أحمد بن حنبل: متروك الحديث حديثه موضوع كذب. وقال يحيى: هو من المعروفين بالكذب ووضع الحديث"[٤٠]. وقال السعدي معلى كذاب وقال النسائي: "متروك الحديث"[٤١]. وقال ابن حبان: "يروي الموضوعات عن أقوام ثقات. وكان أمياً لا يكتب، وكان غالياً في التشيع يشتم أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم. لا تحل الرواية عنه بحال، ولا كتابة حديثه إلا على جهة التعجب"[٤٢].

(٧) - ٤٢٤ – حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُصَفَّى الْحِمْصِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْفَضْلِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: رَأَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَجُلًا يَتَوَضَّأُ، فَقَالَ: «لَا تُسْرِفْ، لَا تُسْرِفْ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٤٣].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته محمد بن الفضل بن عطية بن عمر بن خالد العبسي[٤٤].كان أبو بكر ابن أبي شيبة شديد الحمل عليه[٤٥]. قال يحيى بن معين: "كان محمد بن الفضل كذاباً"[٤٦]. وقال أحمد: "ليس بشيء حديثه حديث أهل الكذب"[٤٧]. وقال النسائي: "متروك الحديث"[٤٨]. وقال ابن حبان: "يروي الموضوعات عن الأثبات"[٤٩].

(٨) - ٧١٢ – حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُصَفَّى الْحِمْصِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ، عَنْ مَرْوَانَ بْنِ سَالِمٍ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ أَبِي رَوَّادٍ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:«خَصْلَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ فِي أَعْنَاقِ الْمُؤَذِّنِينَ لِلْمُسْلِمِينَ، صَلَاتُهُمْ وَصِيَامُهُمْ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف لتدليس بقية بن الوليد"[٥٠].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته مروان بن سالم الغفاري[٥١]. قال أحمد وغيره: "ليس بثقة"[٥٢]. وقال أبو حاتم: "منكر الحديث جداً، ضعيف الحديث، ليس له

حديث قائم"[٥٣]. قال العقيلي: "أحاديثه مناكير، لا يتابع عليها إلا من طريق يقاربه"[٥٤]. وقال البخاري: "منكر الحديث"[٥٥]. وقال النسائي: "متروك الحديث"[٥٦]. وقال ابن حبان: "يروي المناكير عن المشاهير، ويأتي عن الثقات ما ليس من حديث الأثبات"[٥٧].

(٩) - ٨٩٦ - **حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ الصَّبَّاحِ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ قَالَ: أَنْبَأَنَا الْعَلَاءُ أَبُو مُحَمَّدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ، يَقُولُ: قَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا رَفَعْتَ رَأْسَكَ مِنَ السُّجُودِ، فَلَا تُقْعِ كَمَا يُقْعِي الْكَلْبُ، ضَعْ أَلْيَتَيْكَ بَيْنَ قَدَمَيْكَ، وَأَلْزِقْ ظَاهِرَ قَدَمَيْكَ بِالْأَرْضِ»**. **ذكره البوصيري في الزوائد**، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٥٨].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته العلاء أبو محمد البصري، هو: العلاء بن زيد، ويعرف بابن زيدل الثقفي أبو محمد البصري[٥٩].قال ابن المديني: "كان يضع الحديث"[٦٠]. وقال أبو حاتم: "منكر الحديث متروك الحديث"[٦١]. وقال البخاري[٦٢]، والعقيلي: "منكر الحديث"[٦٣]. وقال ابن حبان: "يروي عن أنس بن مالك نسخة موضوعة، لا يحل ذكره في الكتب إلا على سبيل التعجب"[٦٤]. وقال الدارقطني: "متروك الحديث"[٦٥].

(١٠) - ٩٦٨ - **حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ قَالَ: أَنْبَأَنَا حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ، فَلْيَضَعْ يَدَهُ عَلَى فِيهِ، وَلَا يَعْوِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَضْحَكُ مِنْهُ»**. **ذكره البوصيري في الزوائد**، وقال: "هذا إسناد فيه عبد الله بن سعيد متفق على تضعيفه"[٦٦].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عبد الله بن سعيد بن أبي سعيد ، واسمه كيسان، المقبري، أبو عباد الليثي[٦٧]. قال يحيى القطان: "استبان لي كذبه في مجلس"[٦٨]. وقال أحمد بن حنبل: "منكر الحديث، متروك الحديث"[٦٩]. وقال

النسائي والدارقطني: "متروك الحديث"[٧٠]. وقال ابن حبان: "كان ممن يقلب الأخبار ويهم في الآثار وحتى يسبق إلى قلب من يسمعها أنه كان المتعمد لها"[٧١].

(١١) - ١٢٢٤ – حَدَّثَنَا عَبْدُ الْحَمِيدِ بْنُ بَيَانٍ الْوَاسِطِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ الْأَزْرَقُ، عَنْ سُفْيَانَ، عَنْ جَابِرٍ، عَنْ أَبِي حَرِيزٍ، عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ، قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ «صَلَّى جَالِسًا عَلَى يَمِينِهِ، وَهُوَ وَجِعٌ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه جابر وهو ابن يزيد الجعفي وقد اتهم، وأبو حريز هذا مجهول"[٧٢].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته جابر بن يزيد الجعفي، اتهم بالكذب، كما نقل ذلك البخاري وابن عدي. وقال ابن عدي: "أقرب إلى الضعف منه إلى الصدق"[٧٣]. قال النسائي: "متروك"[٧٤].

(١٢) - ١٢٤٢ – حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ بَكْرٍ الضَّبِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَعْلَى زُنْبُورٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَنْبَسَةُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ نَافِعٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ «نُهِيَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْقُنُوتِ فِي الْفَجْرِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٧٥].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عنبسة بن عبد الرحمن بن عنبسة بن سعيد بن العاص الأموي، قال أبو حاتم: "هو متروك الحديث كان يضع الحديث"[٧٦]. وقال ابن عدي: "منكر الحديث"[٧٧]. وقال ابن حبان: "صاحب أشياء موضوعة، وما لا أصل له مقلوب، لا يحل الاحتجاج به"[٧٨].

(١٣) - ١٣١٦ – حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَهْضَمِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا يُوسُفُ بْنُ خَالِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ الْخَطْمِيُّ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُقْبَةَ بْنِ الْفَاكِهِ بْنِ سَعْدٍ، عَنْ جَدِّهِ الْفَاكِهِ بْنِ سَعْدٍ، وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ «كَانَ يَغْتَسِلُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَيَوْمَ النَّحْرِ وَيَوْمَ عَرَفَةَ»، وَكَانَ الْفَاكِهُ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالْغُسْلِ فِي هَذِهِ الْأَيَّامِ. ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٧٩].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته يوسف بن خالد السمتي، قال ابن معين: كذاب زنديق لا يكتب عنه، وقال في موضع آخر: كذّاب خبيث عدو الله رجل سوء رأيته في البصرة ما لا أحصي لا يحدث عنه أحدٌ فيه خير. وقال عمرو بن علي الفلاس: يكذب. وقال أبو داود: كذاب. وقال ابن حبان: كان يضع الحديث على الشيوخ ويقرأ عليهم ثم يرويها عنهم. لا تحل الرواية عنه.

(١٤) - ١٣٧٣ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ الْوَلِيدِ الْمَدِينِيُّ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى، بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ، عِشْرِينَ رَكْعَةً بَنَى اللَّهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(٨٠).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته يعقوب بن الوليد بن عبد الله بن أبي هلال الأزدي(٨١). قال الإمام أحمد: "كان من الكذابين الكبار وكان يضع الحديث"(٨٢). وقال أبو حاتم: "كان يكذب"، وقال أبو زرعة: "ليس بشئ"(٨٣). وقال النسائي: "ليس بشيء متروك"(٨٤). قال ابن حبان: "كان ممن يضع الحديث على الثقات لا يحل كتابة حديثه إلا على جهة التعجب"(٨٥).

(١٥) - ١٣٨٨ - حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ الْخَلَّالُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَنْبَأَنَا ابْنُ أَبِي سَبْرَةَ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:"إِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَقُومُوا لَيْلَهَا وَصُومُوا نَهَارَهَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَنْزِلُ فِيهَا لِغُرُوبِ الشَّمْسِ إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَقُولُ: أَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ لِي فَأَغْفِرَ لَهُ أَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَأَرْزُقَهُ أَلَا مُبْتَلًى فَأُعَافِيَهُ أَلَا كَذَا أَلَا كَذَا، حَتَّى يَطْلُعَ الْفَجْرُ". ذكره البوصيري في الزوائد،(٨٦).

قلتُ: موضوع: آفته ابن أبي سبرة، واسمه أبو بكر بن عبد الله بن محمد بن أبي سبرة(٨٧). قال أحمد: "كان يضع الحديث ويكذب"(٨٨). وقال ابن عدي:

"هو في جملة من يضع الحديث"[٨٩]. وقال ابن حبان: "يروي الموضوعات عن الأثبات، لا يحل كتابة حديثه، ولا الاحتجاج به بحال"[٩٠].

(١٦) - ١٤٣٧ – حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مَسْلَمَةُ بْنُ عُلَيٍّ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ، عَنْ حُمَيْدٍ الطَّوِيلِ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا يَعُودُ مَرِيضًا إِلَّا بَعْدَ ثَلَاثٍ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه مسلمة بن علي قال البخاري وأبو حاتم وأبو زرعة منكر الحديث"[٩١].

قلتُ: موضوع: آفته مسلمة بن علي بن خلف الخشني[٩٢]. قال يحيى بن معين: "ليس حديثه بشئ"[٩٣]. وقال البخاري: "منكر الحديث"[٩٤]. وقال النسائي: "متروك الحديث"[٩٥]. وقال أبو زرعة: "منكر الحديث"[٩٦]. وقال ابن حبان: "يقلب الأسانيد، ويروي عن الثقات ما ليس من أحاديثهم توهماً، فلما فحش ذلك منه، بطل الاحتجاج به"[٩٧]. وقال ابن عدي: عامة أحاديثه غير محفوظة"[٩٨]. وسأل ابن أبي حاتم أباه عن هذا الحديث فقال: "هذا حديث باطل موضوع"[٩٩].

(١٧) - ١٤٦١ – حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُصَفَّى الْحِمْصِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ بْنُ الْوَلِيدِ، عَنْ مُبَشِّرِ بْنِ عُبَيْدٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:«لِيُغَسِّلْ مَوْتَاكُمُ الْمَأْمُونُونَ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[١٠٠].

قلتُ: بل هو موضوع: بقية؛ مدلس، وقد رواه بالعنعنة. وشيخه مبشر بْن عُبَيد؛ قال فيه أحمد بن حنبل: "أحاديثه أحاديث موضوعة كذب... ليس بشَيْءٍ يضع الْحَدِيث"[١٠١]. وقال البخاري: منكر الحديث[١٠٢]. وقال الدارقطني: متروك الحديث، يضع الحديث، ويكذب"[١٠٣]. وقال ابن حبان: "يروي عن الثقات الموضوعات لا يحل كتابة حديثه إلا على جهة التعجب"[١٠٤].

(١٨) - ١٤٨٥ – حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدَةَ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَمْرُو بْنُ النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْحَزَوَّرِ، عَنْ نُفَيْعٍ، عَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ، وَأَبِي بَرْزَةَ، قَالَا:

خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي جِنَازَةٍ، فَرَأَى قَوْمًا قَدْ طَرَحُوا، أَرْدِيَتَهُمْ يَمْشُونَ فِي قُمُصٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَبِفِعْلِ الْجَاهِلِيَّةِ تَأْخُذُونَ؟ أَوْ بِصُنْعِ الْجَاهِلِيَّةِ تَشَبَّهُونَ؟ لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَدْعُوَ عَلَيْكُمْ دَعْوَةً تَرْجِعُونَ فِي غَيْرِ صُوَرِكُمْ» قَالَ: فَأَخَذُوا أَرْدِيَتَهُمْ، وَلَمْ يَعُودُوا لِذَلِكَ. ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٠٥).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته نفيع بن الحارث أبو داود الأعمى، نسبه يحيى بن معين وغيره إلى الوضع(١٠٦). وقال البخاري منكر الحديث. وقال الساجي: كان منكر الحديث، يكذب(١٠٧). وقال ابن أبي حاتم: "سألت أبي عن أبي داود نفيع فقال: منكر الحديث ضعيف الحديث. وقال: سئل أبو زرعة عن أبي داود نفيع فقال: لم يكن بشئ"(١٠٨). ونقل ابن عدي قول السعدي: نفيع أَبُو دَاوُد كذاب، يتناول قوماً من الصحابة فاسق. وقول النسائي: نفيع أبو داود متروك الحديث. ثم قال بعد ذلك: هو فِي جملة الغالين بالكوفة"(١٠٩).

(١٩) - ١٧٤٩ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُصَفَّى قَالَ: حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لِبِلَالٍ «الْغَدَاءُ يَا بِلَالُ» فَقَالَ: إِنِّي صَائِمٌ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «نَأْكُلُ أَرْزَاقَنَا، وَفَضْلُ رِزْقِ بِلَالٍ فِي الْجَنَّةِ، أَشَعَرْتَ يَا بِلَالُ أَنَّ الصَّائِمَ تُسَبِّحُ عِظَامُهُ، وَتَسْتَغْفِرُ لَهُ الْمَلَائِكَةُ مَا أُكِلَ عِنْدَهُ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه محمد بن عبد الرحمن متفق على ضعفه، وكذبه أبو حاتم وغيره"(١١٠).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته محمد بن عبد الرحمن القشيري المقدسي، هو من مشائخ بقية المجهولين منكر الحديث، كذاب مشهور(١١١). قال أبو حاتم: "كان يكذب ويفتعل الحديث"(١١٢).

(٢٠) - ١٧٧٧ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنْصُورٍ أَبُو بَكْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الْهَيَّاجُ الْخُرَاسَانِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَنْبَسَةُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ

عَبْدِ الْخَالِقِ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:«الْمُعْتَكِفُ يَتْبَعُ الْجِنَازَةَ، وَيَعُودُ الْمَرِيضَ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه عبد الخالق، وعنبسة، والهياج، وهم ضعفاء. وقد روى الأئمة الستة ما يخالفه من حديث عائشة مرفوعاً: "كان لا يدخل البيت إلا لحاجة إذا كانوا معتكفين"(١١٣).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عنبسة بن عبد الرحمن بن عنبسة بن سعيد بن العاص الأموي، قال أبو حاتم: "هو متروك الحديث كان يضع الحديث"(١١٤). وقال ابن عدي: "منكر الحديث"(١١٥). وقال ابن حبان: "صاحب أشياء موضوعة، وما لا أصل له مقلوب، لا يحل الاحتجاج به"(١١٦).

(٢١) - ١٧٩٧ – حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الْوَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ، عَنِ الْبَخْتَرِيِّ بْنِ عُبَيْدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَعْطَيْتُمُ الزَّكَاةَ فَلَا تَنْسَوْا ثَوَابَهَا، أَنْ تَقُولُوا: اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا مَغْنَمًا، وَلَا تَجْعَلْهَا مَغْرَمًا». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١١٧).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته البختري بن عبيد الطائي من أهل الشام، ضعيف الحديث ذاهب"(١١٨). وقال ابن حبان: يروي عن أبيه عن أبي هريرة نسخة فيها عجائب لا يحل الاحتجاج به إذا انفرد لمخالفته الأثبات في الروايات مع عدم تقدم عدالته"(١١٩). وقال الأزدي: "كذاب ساقط"(١٢٠). وأما أبو نعيم الحافظ فقال: روى عن أبيه موضوعات"(١٢١).

(٢٢) - ٢١٥٢ – حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ رَافِعٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ هَارُونَ، عَنْ هَمَّامٍ، عَنْ فَرْقَدٍ السَّبَخِيِّ، عَنْ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الشِّخِّيرِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَكْذَبُ النَّاسِ الصَّبَّاغُونَ وَالصَّوَّاغُونَ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه فرقد السبخي وهو ضعيف، وعمرو بن هارون كذبه ابن معين، وغيره"(١٢٢).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته فرقد بن يعقوب بصري. قال الإمام أحمد بن حنبل: "ليس هو بقوي في الحديث قلت هو ضعيف قال ليس هو بذاك"(١٢٣). وقال البخاري: "في حديثه مناكير"(١٢٤). وقال أبو حاتم بعد أن ساق هذا الحديث من طريق آخر: "هذا حديث كذب"(١٢٥).

(٢٣) - ٢٣٠٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عُرْوَةَ، عَنِ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْأَغْنِيَاءَ بِاتِّخَاذِ الْغَنَمِ، وَأَمَرَ الْفُقَرَاءَ بِاتِّخَاذِ الدَّجَاجِ، وَقَالَ: «عِنْدَ اتِّخَاذِ الْأَغْنِيَاءِ الدَّجَاجَ، يَأْذَنُ اللَّهُ بِهَلَاكِ الْقُرَى». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٢٦).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته علي بن عروة الدمشقي القرشي(١٢٧)، قال ابن عدي: "منكر الحديث"(١٢٨). وساق من مناكيره هذا الحديث. وكذبه صالح جزرة قال: "حديثه كذب كله"(١٢٩). وقال ابن حبان: "كان ممن يضع الحديث على قلته"(١٣٠).

(٢٤) - ٢٣٧٣ - حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْفُرَاتِ، عَنْ مُحَارِبِ بْنِ دِثَارٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:«لَنْ تَزُولَ قَدَمُ شَاهِدِ الزُّورِ حَتَّى يُوجِبَ اللَّهُ لَهُ النَّارَ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٣١).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته محمد بن الفرات أبو علي التميمي الكوفي(١٣٢)، كذبه أحمد وأبو بكر ابن أبي شيبة(١٣٣). وقال أبو داود: روى عن محارب بن دثار أحاديث موضوعه(١٣٤). وقال ابن حبان: "كان ممن يروي المعضلات عن الأثبات حتى إذا سمعها من الحديث صناعته علم أنها موضوعة لا يحل الاحتجاج به"(١٣٥).

(٢٥) - ٢٥١٤ – حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ ظَبْيَانَ، عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الْمُدَبَّرُ مِنَ الثُّلُثِ». قَالَ ابْنُ مَاجَةَ: سَمِعْتُ عُثْمَانَ يَعْنِي ابْنَ أَبِي شَيْبَةَ، يَقُولُ: هَذَا خَطَأٌ. يَعْنِي حَدِيثَ «الْمُدَبَّرُ مِنَ الثُّلُثِ». قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ: «لَيْسَ لَهُ أَصْلٌ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٣٦).

قلتُ: بل هو موضوع: وهذا الحديث فقط الذي حكم ابن ماجه نفسه بوضعه، آفته علي بن ظبيان العبسي(١٣٧). قال النسائي: "متروك الحديث"(١٣٨). وقال ابن حبان: "كان ممن يقلب الأخبار ولا يعلم، ويخطيء في الآثار ولا يفهم، فلما كثر ذلك في روايته؛ سقط الاحتجاج بأخباره"(١٣٩). وقال أبو زرعة: "هذا حديث باطل"(١٤٠)؛ وامتنع من قراءته. وقال العقيلي: منكر الحديث، ثم ذكر من منكراته هذا الحديث(١٤١).

(٢٦) - ٢٦١٣ – حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ أَبِي الرَّبِيعِ الْجُرْجَانِيُّ قَالَ: أَنْبَأَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ الْعَلَاءِ، أَنَّهُ سَمِعَ بِشْرَ بْنَ نُمَيْرٍ، أَنَّهُ سَمِعَ مَكْحُولًا يَقُولُ: إِنَّهُ سَمِعَ يَزِيدَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ، أَنَّهُ سَمِعَ صَفْوَانَ بْنَ أُمَيَّةَ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ، فَجَاءَهُ عَمْرُو بْنُ قُرَّةَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ قَدْ كَتَبَ عَلَيَّ الشِّقْوَةَ، فَمَا أُرَانِي أُرْزَقُ إِلَّا مِنْ دُفِّي بِكَفِّي، فَأْذَنْ لِي فِي الْغِنَاءِ فِي غَيْرِ فَاحِشَةٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا آذَنُ لَكَ، وَلَا كَرَامَةَ، وَلَا نُعْمَةَ عَيْنٍ، كَذَبْتَ، أَيْ عَدُوَّ اللَّهِ، لَقَدْ رَزَقَكَ اللَّهُ طَيِّبًا حَلَالًا، فَاخْتَرْتَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْكَ مِنْ رِزْقِهِ مَكَانَ مَا أَحَلَّ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لَكَ مِنْ حَلَالِهِ، وَلَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ إِلَيْكَ لَفَعَلْتُ بِكَ وَفَعَلْتُ. قُمْ عَنِّي، وَتُبْ إِلَى اللَّهِ. أَمَا إِنَّكَ إِنْ فَعَلْتَ بَعْدَ التَّقْدِمَةِ إِلَيْكَ، ضَرَبْتُكَ ضَرْبًا وَجِيعًا، وَحَلَقْتُ رَأْسَكَ مُثْلَةً، وَنَفَيْتُكَ مِنْ أَهْلِكَ، وَأَحْلَلْتُ سَلَبَكَ نُهْبَةً لِفِتْيَانِ أَهْلِ الْمَدِينَةِ» . فَقَامَ عَمْرٌو، وَبِهِ مِنَ الشَّرِّ

وَالْخِزْيِ مَا لَا يَعْلَمُهُ إِلَّا اللَّهُ فَلَمَّا وَلَّى، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «هَؤُلَاءِ الْعُصَاةُ، مَنْ مَاتَ مِنْهُمْ بِغَيْرِ تَوْبَةٍ حَشَرَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَمَا كَانَ فِي الدُّنْيَا مُخَنَّثًا عُرْيَانًا لَا يَسْتَتِرُ مِنَ النَّاسِ بِهُدْبَةٍ، كُلَّمَا قَامَ صُرِعَ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٤٢).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته بشر بن نمير القشيري البصري(١٤٣). ترك الناس حديثه(١٤٤). قال يحي بن سعيد كان ركناً من أركان الكذب ... وفي رواية عن أحمد قال يحيى بن العلاء: كذاب يضع الحديث"(١٤٥). وقال ابن حبان: "منكر الحديث جداً"(١٤٦).

(٢٧) - ٢٧٣٦ – حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، وَمُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى قَالَا: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى، عَنِ الْحَسَنِ بْنِ صَالِحٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سَعِيدٍ، وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى: عَنْ عُمَرَ بْنِ سَعِيدٍ، عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي، عَنْ جَدِّي عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، قَامَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ فَقَالَ: «الْمَرْأَةُ تَرِثُ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا وَمَالِهِ، وَهُوَ يَرِثُ مِنْ دِيَتِهَا وَمَالِهَا، مَا لَمْ يَقْتُلْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَإِذَا قَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ عَمْدًا لَمْ يَرِثْ مِنْ دِيَتِهِ وَمَالِهِ شَيْئًا، وَإِنْ قَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ خَطَأً وَرِثَ مِنْ مَالِهِ وَلَمْ يَرِثْ مِنْ دِيَتِهِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٤٧).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته الزنديق محمد بن سعيد بن حسان بن قيس القرشي الأسدي المصلوب(١٤٨). كان يضع الحديث عمداً(١٤٩). صلبه المنصور على الزندقة، وضع أربعة آلاف حديث، قلبوا اسمه على مائة وجه ليخفى(١٥٠)! قال ابن حبان: "يضع الحديث على الثقات ويروي عن الأثبات ما لا أصل له لا يحل ذكره في الكتب إلا على سبيل القدح فيه ولا الرواية عنه بحال من الأحوال"(١٥١).

(٢٨) - ٢٧٦٨ – حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَعْلَى السُّلَمِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ صُبْحٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ

مَكْحُولٍ، عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَرِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مِنْ وَرَاءِ عَوْرَةِ الْمُسْلِمِينَ، مُحْتَسِبًا مِنْ غَيْرِ شَهْرِ رَمَضَانَ أَعْظَمُ أَجْرًا مِنْ عِبَادَةِ مِائَةِ سَنَةٍ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا، وَرِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مِنْ وَرَاءِ عَوْرَةِ الْمُسْلِمِينَ، مُحْتَسِبًا مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ أَفْضَلُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَعْظَمُ أَجْرًا – أُرَاهُ قَالَ – مِنْ عِبَادَةِ أَلْفِ سَنَةٍ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا، فَإِنْ رَدَّهُ اللَّهُ إِلَى أَهْلِهِ سَالِمًا، لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْهِ سَيِّئَةٌ أَلْفَ سَنَةٍ، وَتُكْتَبُ لَهُ الْحَسَنَاتُ، وَيُجْرَى لَهُ أَجْرُ الرِّبَاطِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٥٢).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عمر بن «صبيح»(١٥٣) بن عمران التميمي، يكنى أبا نعيم. أحد الكذابين المعروفين بوضع الحديث، ليس بثقة ولا مأمون(١٥٤)، فقد اعترف بوضع الحديث(١٥٥). قال ابن حبان: "كان ممن يضع الحديث على الثقات لا يحل كتابة حديثه إلا على جهة التعجب لأهل الصناعة فقط"(١٥٦). وقد قال الحافظ المنذري بعد أن عزاه لابن ماجه: "وآثار الوضع ظاهرة عليه، ولا عجب فراويه عمر بن صبيح الخراساني، ولولا أنه في الأصول لما ذكرته"(١٥٧).

(٢٩) - ٢٧٧٠ – حَدَّثَنَا عِيسَى بْنُ يُونُسَ الرَّمْلِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ شُعَيْبِ بْنِ شَابُورَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ خَالِدِ بْنِ أَبِي الطَّوِيلِ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «حَرَسُ لَيْلَةٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَفْضَلُ مِنْ صِيَامِ رَجُلٍ وَقِيَامِهِ فِي أَهْلِهِ أَلْفَ سَنَةٍ: السَّنَةُ ثَلَاثُمِائَةٍ وَسِتُّونَ يَوْمًا، وَالْيَوْمُ كَأَلْفِ سَنَةٍ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٥٨).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته سعيد بن خالد بن أبي طويل(١٥٩). قال العقيلي: "لا يتابع على حديثه"(١٦٠). وقال أبو حاتم: "لا يشبه حديثه حديث أهل الصدق، منكر الحديث، وأحاديثه عن أنس لا تعرف"(١٦١). وقال ابن حجر: "قال البخاري: فيه نظر. وقال الحاكم أبو عبد الله: روى عن أنس أحاديث موضوعة"(١٦٢).

وتعجب من هذا الحديث الذهبي، فقال: "فهذه عبارة عجيبة، لو صحت، لكان مجموع ذلك ثلاثمائة ألف ألف سنة وستين ألف ألف سنة!" [١٦٣]. وقال عنه المنذري: "يشبه أن يكون موضوعاً"[١٦٤].

(٣٠) - ٢٧٨٠ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَسَدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا دَاوُدُ بْنُ الْمُحَبَّرِ قَالَ: أَنْبَأَنَا الرَّبِيعُ بْنُ صَبِيحٍ، عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبَانَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:«سَتُفْتَحُ عَلَيْكُمُ الْآفَاقُ، وَسَتُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مَدِينَةٌ يُقَالُ لَهَا قَزْوِينُ، مَنْ رَابَطَ فِيهَا أَرْبَعِينَ يَوْمًا أَوْ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً، كَانَ لَهُ فِي الْجَنَّةِ عَمُودٌ مِنْ ذَهَبٍ، عَلَيْهِ زَبَرْجَدَةٌ خَضْرَاءُ، عَلَيْهَا قُبَّةٌ مِنْ يَاقُوتَةٍ حَمْرَاءَ، لَهَا سَبْعُونَ أَلْفَ مِصْرَاعٍ مِنْ ذَهَبٍ، عَلَى كُلِّ مِصْرَاعٍ زَوْجَةٌ مِنَ الْحُورِ الْعِينِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[١٦٥].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته داود بن المحبر بن قحذم البصري[١٦٦]. قال البخاري: "منكر الحديث، قال أحمد: شبه لا شئ لا يدري ما الحديث"[١٦٧]. وقال أبو حاتم: "غير ثقة، ذاهب الحديث، منكر الحديث"[١٦٨]. وقال الدارقطني: "يضع، بصري كان ببغداد، متروك"[١٦٩]. وقال ابن عدي: "منكر الحديث"[١٧٠]. وقال ابن حبان: "كان يضع الحديث على الثقات ويروي عن المجاهيل المقلوبات كان أحمد بن حنبل رحمه الله يقول هو كذاب"[١٧١]. وقال ابن الجوزي: هذا حديث موضوع بلا شك ... ولا أتهم بوضع هذا الحديث غيره - داود بن المحبر-، والعجب من ابن ماجة مع علمه؛ كيف استحل أن يذكر هذا في كتاب السنن؟!"[١٧٢]. وقال الذهبي: "قد شان ابن ماجة سننه بإدخاله هذا الحديث الموضوع فيها"[١٧٣].

(٣١) - ٣١١٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي عُمَرَ الْعَدَنِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحِيمِ بْنُ زَيْدٍ الْعَمِّيُّ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَدْرَكَ رَمَضَانَ بِمَكَّةَ، فَصَامَهُ، وَقَامَ مِنْهُ مَا تَيَسَّرَ لَهُ، كَتَبَ اللَّهُ لَهُ

مِائَةَ أَلْفِ شَهْرِ رَمَضَانَ، فِيمَا سِوَاهَا، وَكَتَبَ اللَّهُ لَهُ، بِكُلِّ يَوْمٍ عِتْقَ رَقَبَةٍ، وَكُلِّ لَيْلَةٍ عِتْقَ رَقَبَةٍ، وَكُلِّ يَوْمٍ حُمْلَانَ فَرَسٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَفِي كُلِّ يَوْمٍ حَسَنَةً، وَفِي كُلِّ لَيْلَةٍ حَسَنَةً».

قلتُ: هو من زوائد ابن ماجه ولم أجده عند البوصيري. موضوع:

آفته عبد الرحيم بن زيد العمي، فإنّه كذابٌ. قال ابن حبان: "يروي عن أبيه العجائب لا يشك من الحديث صناعته أنها معمولة أو مقلوبة كلها"(١٧٤). وقال ابن حجر: "كذبه ابن معين"(١٧٥). وقال الذهبي: "قال البخاري: تركوه. وقال يحيى: كذاب. وقال – مرة: ليس بشئ. وقال الجوزجاني: غير ثقة"(١٧٦). وقال ابن الجوزي: "قال يحيى: ليس بشئ هو وأبوه، وقال مرة: عبد الرحيم كذاب خبيث، وقال النسائي: متروك الحديث، وقال ابن عدي: هذا حديث منكر لا أعرفه إلا من هذا الطريق، وكل أحاديثه لا يتابعه الثقاة عليها"(١٧٧).

قال أبو حاتم: "هذا حديث منكر، وعبدالرحيم بن زيد، متروك الحديث"(١٧٨). وقال الألباني: "لوائح الوضع عليه ظاهرة، وآفته عبد الرحيم هذا، فقد قال ابن معين فيه: كذاب خبيث. وقال النسائي: ليس بثقة ولا مأمون"(١٧٩).

(٣٢) - ٣٢٢١ – حَدَّثَنَا هَارُونُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْحَمَّالُ قَالَ: حَدَّثَنَا هَاشِمُ بْنُ الْقَاسِمِ قَالَ: حَدَّثَنَا زِيَادُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُلَاثَةَ، عَنْ مُوسَى بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَابِرٍ، وَأَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: كَانَ إِذَا دَعَا عَلَى الْجَرَادِ قَالَ: «اللَّهُمَّ أَهْلِكْ كِبَارَهُ، وَاقْتُلْ صِغَارَهُ، وَأَفْسِدْ بَيْضَهُ، وَاقْطَعْ دَابِرَهُ، وَخُذْ بِأَفْوَاهِهَا، عَنْ مَعَايِشِنَا وَأَرْزَاقِنَا، إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ» فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ تَدْعُو عَلَى جُنْدٍ مِنْ أَجْنَادِ اللَّهِ بِقَطْعِ دَابِرِهِ قَالَ: «إِنَّ الْجَرَادَ نَثْرَةُ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ» قَالَ هَاشِمٌ: قَالَ زِيَادٌ: فَحَدَّثَنِي مَنْ رَأَى الْحُوتَ يَنْثُرُهُ.

ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(١٨٠).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته موسى بن محمد بن إبراهيم التيمي[١٨١] عن أبيه، عن أنس، مديني لا يتابع على حديثه , ولا يعرف إلا به". وقال أبو حاتم: "ضعيف الحديث منكر الحديث"[١٨٢]. وقال ابن حبان: "يروي عن أبيه ما ليس من حديثه. فلست أدري أكان المتعمد لذلك؟ أو كان فيه غفلة فيأتي بالمناكير عن أبيه والمشاهير على التوهم؟! وأيما كان فهو ساقط الاحتجاج"[١٨٣].وقال ابن الجوزي: "هذا لا يصح عن رسول الله ﷺ. قال يحيى: موسى بن محمد ليس بشئ ولا يكتب حديثه. وقال النسائي: منكر الحديث[١٨٤]، وقال الدارقطني: متروك"[١٨٥].

(٣٣) - ٣٣١٨ – حَدَّثَنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عُثْمَانَ الدِّمَشْقِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا الْوَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَنْبَسَةُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زَاذَانَ، أَنَّهُ حَدَّثَهُ قَالَ: حَدَّثَتْنِي أُمُّ سَعْدٍ، قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى عَائِشَةَ، وَأَنَا عِنْدَهَا، فَقَالَ: «هَلْ مِنْ غَدَاءٍ؟» قَالَتْ: عِنْدَنَا خُبْزٌ، وَتَمْرٌ، وَخَلٌّ، فَقَالَ: رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:«نِعْمَ الْإِدَامُ الْخَلُّ، اللَّهُمَّ بَارِكْ فِي الْخَلِّ، فَإِنَّهُ كَانَ إِدَامَ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِي، وَلَمْ يَفْتَقِرْ بَيْتٌ فِيهِ خَلٌّ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "فيه محمد بن زاذان وعنبسة بن عبد الرحمن وهما ضعيفان"[١٨٦].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عنبسة بن عبد الرحمن بن عنبسة بن سعيد بن العاص الأموي، قال أبو حاتم: "هو متروك الحديث كان يضع الحديث"[١٨٧]. وقال ابن عدي: "منكر الحديث"[١٨٨]. وقال ابن حبان: "صاحب أشياء موضوعة، وما لا أصل له مقلوب، لا يحل الاحتجاج به"[١٨٩].

(٣٤) - ٣٣٣٠ – حَدَّثَنَا أَبُو بِشْرٍ بَكْرُ بْنُ خَلَفٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَدَنِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلُوا الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ، كُلُوا الْخَلَقَ بِالْجَدِيدِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَغْضَبُ، وَيَقُولُ بَقِيَ ابْنُ آدَمَ، حَتَّى أَكَلَ الْخَلَقَ بِالْجَدِيدِ». ذكره البوصيري

في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه أبو زكير يحيى بن محمد بن قيس، وهو ضعيف"[١٩٠].

قلتُ: بل هو موضوع: قد ساقه ابن الجوزي في الموضوعات[١٩١]، وتبعه السيوطي، وبيّن أنّ فيه أبي زكير يحيى بن محمد بن قيس المدني، وساق الطرق إليه[١٩٢]. قال ابن حبان: "كان ممن يقلب الأسانيد ويرفع المراسيل من غير تعمد فلما كثر ذلك منه صار غير محتج به إلا عند الوفاق، وإن اعتبر بما لم يخالف الأثبات في حديثه فلا ضير"[١٩٣]. وقال النسائي: هذا منكر، واستنكره غير واحد من مؤلفي كتب الضعفاء، مثل ابن حبان، وابن عدي[١٩٤]، والعقيلي[١٩٥].

(٣٥) - ٣٣٤٠ – حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ الضَّحَّاكِ السُّلَمِيُّ أَبُو الْحَارِثِ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَيَّاشٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ طَلْحَةَ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ يَحْيَى، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: أَوَّلُ مَا سَمِعْنَا بِالْفَالُوذَجِ، أَنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ أُمَّتَكَ تُفْتَحُ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ، فَيُفَاضُ عَلَيْهِمْ مِنَ الدُّنْيَا، حَتَّى إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الْفَالُوذَجَ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «وَمَا الْفَالُوذَجُ» ؟ قَالَ: يَخْلِطُونَ السَّمْنَ وَالْعَسَلَ جَمِيعًا، فَشَهِقَ النَّبِيُّ ﷺ لِذَلِكَ شَهْقَةً. ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[١٩٦].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عبد الوهاب بن الضحاك السلمى[١٩٧]. قال أبو حاتم: "كان يكذب"[١٩٨]. وقال البخاري: "عنده عجائب"[١٩٩]. وقال العقيلي والنسائي متروك الحديث[٢٠٠]. وقال ابن حبان كان يسرق الحديث لا يحل الاحتجاج به[٢٠١]. وقال الدارقطني: منكر الحديث[٢٠٢].

(٣٦) - ٣٣٥٢ – حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، وَسُوَيْدُ بْنُ سَعِيدٍ، وَيَحْيَى بْنُ عُثْمَانَ بْنِ سَعِيدِ بْنِ كَثِيرِ بْنِ دِينَارٍ الْحِمْصِيُّ، قَالُوا: حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ بْنُ الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا يُوسُفُ بْنُ أَبِي كَثِيرٍ، عَنْ نُوحِ بْنِ ذَكْوَانَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ،

قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ مِنَ السَّرَفِ، أَنْ تَأْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(٢٠٣).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته نوح بن ذكوان البصري(٢٠٤). قال أبو حاتم الرازي: "ليس بشيء مجهول"(٢٠٥). وقال ابن حبان منكر الحديث جداً، يجب التنكب عن حديثه"(٢٠٦).

وأورده ابن الجوزي في الموضوعات(٢٠٧)، من رواية الدارقطني عن يحيى بن عثمان حدثنا به، وقال: لا يصح، يحيى منكر الحديث وكذا نوح. وعقب عليه السيوطي في اللآلىء بقوله: "يحيى بريء من عهدته"(٢٠٨).

(٣٧) - ٣٣٥٨ – حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَيْمُونٍ الرَّقِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ، عَنْ عَطَاءٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ مِنَ السُّنَّةِ، أَنْ يَخْرُجَ الرَّجُلُ مَعَ ضَيْفِهِ، إِلَى بَابِ الدَّارِ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(٢٠٩).

قلتُ: بل هو موضوع: وعلته علي بن عروة الدمشقي القرشي(٢١٠). قال ابن حبان: "كان ممن يضع الحديث على قلته"(٢١١). وقال أبو حاتم: متروك الحديث(٢١٢). وقال الذهبي: "كذبه صالح جزرة وغيره. ثم ساق له أحاديث هذا منها"(٢١٣).

(٣٨) - ٣٥٦٨ – حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَسَّانَ الْأَزْرَقُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَجِيدِ بْنُ أَبِي رَوَّادٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مَرْوَانُ بْنُ سَالِمٍ، عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ شُرَيْحِ بْنِ عُبَيْدٍ الْحَضْرَمِيِّ، عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ أَحْسَنَ مَا زُرْتُمُ اللَّهَ بِهِ فِي قُبُورِكُمْ، وَمَسَاجِدِكُمْ، الْبَيَاضُ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"(٢١٤).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته مروان بن سالم الغفاري، أبو عبد الله الشامي(٢١٥). وهو ليس بشئ، قال أحمد بن حنبل: ليس بثقة. وقال النسائي(٢١٦)

والدارقطني: متروك[٢١٧]. وقال أبو حاتم: "منكر الحديث جداً ضعيف الحديث ليس له حديث قائم"[٢١٨]. وقال ابن معين: ليس بثقة"[٢١٩]. وذكره ابن الجوزي في الموضوعات وقال: "هذا حديث لا يصح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم"[٢٢٠].

(٣٩) - ٤٠٥٤ – حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُصَفَّى قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ سِنَانٍ، عَنْ أَبِي الزَّاهِرِيَّةِ، عَنْ أَبِي شَجَرَةَ كَثِيرِ بْنِ مُرَّةَ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ، قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ إِذَا أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ عَبْدًا، نَزَعَ مِنْهُ الْحَيَاءَ، فَإِذَا نَزَعَ مِنْهُ الْحَيَاءَ، لَمْ تَلْقَهُ إِلَّا مَقِيتًا مُمَقَّتًا، فَإِذَا لَمْ تَلْقَهُ إِلَّا مَقِيتًا مُمَقَّتًا، نُزِعَتْ مِنْهُ الْأَمَانَةُ، فَإِذَا نُزِعَتْ مِنْهُ الْأَمَانَةُ، لَمْ تَلْقَهُ إِلَّا خَائِنًا مُخَوَّنًا، فَإِذَا لَمْ تَلْقَهُ إِلَّا خَائِنًا مُخَوَّنًا، نُزِعَتْ مِنْهُ الرَّحْمَةُ، فَإِذَا نُزِعَتْ مِنْهُ الرَّحْمَةُ، لَمْ تَلْقَهُ إِلَّا رَجِيمًا مُلَعَّنًا، فَإِذَا لَمْ تَلْقَهُ إِلَّا رَجِيمًا مُلَعَّنًا، نُزِعَتْ مِنْهُ رِبْقَةُ الْإِسْلَامِ». **ذكره البوصيري في الزوائد،** وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٢٢١].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته سعيد بن سنان وهو أبو مهدي الحنفي الحمص[٢٢٢]. قال الدارقطني: "كان يتهم بوضع الحديث"[٢٢٣]. وقال الجوزجاني: "أخاف أن تكون أحاديثه موضوعة". وقال البخاري: "منكر الحديث". وقال النسائي: "متروك الحديث"[٢٢٤]. وقال يحيى: "ليس بثقة"[٢٢٥]. وقال أبوحاتم: "ضعيف الحديث، منكر الحديث"[٢٢٦]. وقال الذهبي: "متروك متهم"[٢٢٧].

(٤٠) - ٤٠٥٧ – حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ الْخَلَّالُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْنُ بْنُ عُمَارَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُثَنَّى بْنِ ثُمَامَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ أَبِي قَتَادَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْآيَاتُ بَعْدَ الْمِائَتَيْنِ». **ذكره البوصيري في الزوائد،** وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٢٢٨].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عون بن عمارة العبدي القيسي[٢٢٩]. قال العقيلي: "سمعت البخاري قال: عون بن عمارة تعرف وتنكر. ولا يعرف إلا به،

وقد يروى هذا عن ابن سيرين من قوله"[٢٣٠]. وقال البخاري لما ذكر حديثه من طريق أبي قتادة (الآيات بعد المائتين): فقد مضى مائتان ولم يأت من الآيات شيء"[٢٣١]. وهذه إشارة إلى بطلانه. ولهذا جزم ابن القيم بوضعه[٢٣٢]، وأما الحاكم فقال: "صحيح على شرط الشيخين"! وقد تعقبه الذهبي بقوله: "قلتُ: أحسبه موضوعاً". قال المناوي عقبة: وسبقه إلى الحكم بوضعه ابن الجوزي، وتعقبه المصنف فما راح ولا جاء!. وقال في التيسير: "صححه الحاكم. فأنكروا عليه وقالوا: واه جداً. بل قيل بوضعه"[٢٣٣]. وأورده ابن الجوزي في الموضوعات، من طريق محمد بن يونس الكديمي عن عون به. وقال: "هذا حديث موضوع على رسول الله صلى الله عليه وسلم. وعون وابن الميني ضعيفان، غير أن المتهم به الكديمي"[٢٣٤].

(٤١) - ٤٠٨٧ – هَدِيَّةُ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَ: حَدَّثَنَا سَعْدُ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ بْنِ جَعْفَرٍ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زِيَادٍ الْيَمَامِيِّ، عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ عَمَّارٍ، عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، يَقُولُ: «نَحْنُ وَلَدَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، سَادَةُ أَهْلِ الْجَنَّةِ، أَنَا، وَحَمْزَةُ، وَعَلِيٌّ، وَجَعْفَرٌ، وَالْحَسَنُ، وَالْحُسَيْنُ، وَالْمَهْدِيُّ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه مقال"[٢٣٥].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته علي بن زياد اليمامي[٢٣٦]. قال ابن حجر: "الصواب أنه عبد الله بن زياد فقد ذكره البخاري وأبو حاتم فقالا: روى عن عكرمة بن عمار، وعنه سعد بن عبد الحميد"[٢٣٧]. قال البخاري: "منكر الحديث"[٢٣٨]. وقال الحاكم: "صحيح على شرط مسلم"! ورده الذهبي بقوله: "قلتُ: ذا موضوع"[٢٣٩].

قلتُ: وعبد الله بن زياد مع أنه ليس من رجال مسلم؛ فقد قال فيه البخاري: "منكر الحديث"، فكيف يكون على شرط مسلم؟!

(٤٢) - ٤٠٩٤ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَيْمُونٍ الرَّقِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو يَعْقُوبَ الْخُنَيْنِيُّ، عَنْ كَثِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَكُونَ أَدْنَى مَسَالِحِ الْمُسْلِمِينَ بِبَوْلَاءَ» ثُمَّ قَالَ ﷺ: «يَا عَلِيُّ، يَا عَلِيُّ، يَا عَلِيُّ،» قَالَ: بِأَبِي، وَأُمِّي، قَالَ: «إِنَّكُمْ سَتُقَاتِلُونَ بَنِي الْأَصْفَرِ، وَيُقَاتِلُهُمُ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِكُمْ، حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ رُوقَةُ الْإِسْلَامِ، أَهْلُ الْحِجَازِ، الَّذِينَ لَا يَخَافُونَ فِي اللَّهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ، فَيَفْتَتِحُونَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ بِالتَّسْبِيحِ وَالتَّكْبِيرِ، فَيُصِيبُونَ غَنَائِمَ لَمْ يُصِيبُوا مِثْلَهَا، حَتَّى يَقْتَسِمُوا بِالْأَتْرِسَةِ، وَيَأْتِي آتٍ فَيَقُولُ: إِنَّ الْمَسِيحَ قَدْ خَرَجَ فِي بِلَادِكُمْ، أَلَا وَهِيَ كِذْبَةٌ فَالْآخِذُ نَادِمٌ، وَالتَّارِكُ نَادِمٌ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف"[٢٤٠].

قلتُ: بل هو موضوع: آفته كثير بن عبد الله بن عمرو بن عوف المزني[٢٤١]. قال ابن حبان: "منكر الحديث جداً. يروي عن أبيه عن جده نسخة موضوعة، لا يحل ذكرها في الكتب، ولا الرواية عنه إلا على جهة التعجب"[٢٤٢]. وقال النسائي: "متروك الحديث"[٢٤٣].وكان الإمام أحمد قد ضرب على حديثه في المسند ولم يحدث به. وقال يحيى بن معين: "ليس هو بشيء"[٢٤٤]. وقال أبو زرعة: "واهي الحديث. وقال الشافعي: هو ركن من أركان الكذب"[٢٤٥].

(٤٣) - ٤٢٩٧ - حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ أَعْيَنَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ يَحْيَى الشَّيْبَانِيُّ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ حَفْصٍ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي بَعْضِ غَزَوَاتِهِ، فَمَرَّ بِقَوْمٍ، فَقَالَ: «مَنِ الْقَوْمُ؟» فَقَالُوا: نَحْنُ الْمُسْلِمُونَ، وَامْرَأَةٌ تَحْصِبُ تَنُّورَهَا، وَمَعَهَا ابْنٌ لَهَا، فَإِذَا ارْتَفَعَ، وَهَجُ التَّنُّورِ تَنَحَّتْ بِهِ، فَأَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ ، فَقَالَتْ: أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ، قَالَ: «نَعَمْ»، قَالَتْ: بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي، أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَرْحَمِ الرَّاحِمِينَ؟

قَالَ: «بَلَى»، قَالَتْ: أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَرْحَمَ بِعِبَادِهِ مِنَ الأُمِّ بِوَلَدِهَا؟ قَالَ: «بَلَى»، قَالَتْ: فَإِنَّ الأُمَّ لَا تُلْقِي وَلَدَهَا فِي النَّارِ، فَأَكَبَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَبْكِي، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَيْهَا، فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ لَا يُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِهِ إِلَّا الْمَارِدَ الْمُتَمَرِّدَ، الَّذِي يَتَمَرَّدُ عَلَى اللَّهِ، وَأَبَى أَنْ يَقُولَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد فيه إسماعيل بن يحيى وهو متهم وعبد الله ضعيف"(٢٤٦).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته إسماعيل بن يحيى الشيباني(٢٤٧). قال العقيلي: "لا يتابع على حديثه"، ثم روى عن يزيد بن هارون أنه قال فيه: "كان كذاباً". وعبد الله بن عمر بن حفص ضعيف"(٢٤٨). وقال ابن حبان: "لا تحل الرواية عنه"(٢٤٩). وقال أبو زرعة: "هذا حديث ليس له عندي أصل. وأبى أن يحدث به"(٢٥٠).

(٤٤) - ٤٣١٣ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ مَرْوَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَنْبَسَةُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ عَلَّاقِ بْنِ أَبِي مُسْلِمٍ، عَنْ أَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَةٌ: الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الْعُلَمَاءُ، ثُمَّ الشُّهَدَاءُ». ذكره البوصيري في الزوائد، وقال: "هذا إسناد ضعيف، لضعف علاق بن أبي مسلم"(٢٥١).

قلتُ: بل هو موضوع: آفته عنبسة بن عبد الرحمن بن عنبسة بن سعيد بن العاص الأموي، قال أبو حاتم: "هو متروك الحديث كان يضع الحديث"(٢٥٢). وقال ابن عدي: "منكر الحديث"(٢٥٣). وقال ابن حبان: "صاحب أشياء موضوعة، وما لا أصل له مقلوب، لا يحل الاحتجاج به"(٢٥٤).

وبعد، فهذا ما استطعتُ جمعه في هذا الموضوع الهام، أسأل الله سبحانه وتعالى أن يكتب لي التوفيق فيه، وأن لا يحرمني أجره، إنّه ولي ذلك والقادر عليه.

خامساً: نتائج البحث:

بعد هذه الدراسة الإستقرائية الشاملة، تبيّن لي ما يلي:

(١) - الأحاديث الموضوعة في سنن ابن ماجه، أربعةً وأربعين حديثاً هي بالأرقام التالية:

(٤٩-٦٥-٥٥-١٤١-٢٢٢-٢٤٨-٤٢٤-٧١٢-٨٩٦-٩٦٨-١٢٢٤-١٢٤٢-١٣١٦-١٣٧٣-١٣٨٨-١٤٣٧-١٤٦١-١٤٨٥-١٧٤٩-١٧٧٧-١٧٩٧-٢١٥٢-٢٣٧٣-٢٥١٤-٢٦١٣-٢٧٣٦-٢٧٦٨-٢٧٧٠-٢٧٨٠-٣١١٧-٣٢٢١-٣٣١٨-٣٣٣٠-٣٣٤٠-٣٣٥٢-٣٣٥٨-٣٥٦٨-٤٠٥٤-٤٠٥٧-٤٠٨٧-٤٠٩٤-٤٢٩٧-٤٣١٣).

(٢) - جميع هذه الأحاديث الموضوعة، هي مما تفرد به ابن ماجه عن الكتب الخمسة. إلاّ الحديث رقم: (٥)-(٢٢٢)، فقد أخرجه الترمذي في جامعه (٤٨/٥) (٢٦٨١).

(٣) - حكم الإمام ابن ماجه على حديث واحدٍ فقط بالوضع! وهو رقم: (٢٥)-(٢٥١٤)، حيث قال عنه: «ليس له أصل».

(٤) - لم يذكر ابن الجوزي في كتابه الموضوعات منها إلا سبعة أحاديث فقط هي: (٦٥-١٤١-٢٧٨٠-٣٢٢١-٣٣٣٠-٣٣٤٠-٣٣٥٢)، هذا من جملة أربعة وثلاثين حديثاً ذكرها من سنن ابن ماجه! فالباقي مما استدركه عليه العلماء، والله الموفق.

(٥) - تساهل البوصيري كتابه مصباح الزجاجة في حكمه على هذه الأحاديث الموضوعة، بأنها ضعيفة الإسناد! مع وجود الكذّابين والوضاعين، وظهور علامات الوضع عليها.

الهوامش والإحالات

(١) الذهبي، الموقظة في علم مصطلح الحديث، تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة، طبع:مكتب المطبوعات الإسلامية ، حلب، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ ، ص:٣٦.

(٢) أخرجه من هذا الوجه: أبو نعيم في الحلية ، ص:٦/٣٧٤ رقم: ٨٩٨٤) والخليلي في الإرشاد ، ص:١/٢٣٣).

(٣) مخرج في الصحيحين من طريق مالك: أخرجه البخاري (رقم: ٥٤، ٤٧٨٣) ومسلم (رقم: ١٩٠٧)، وهو في " الموطأ " من رواية محمد بن الحسن (رقم: ٩٨٣).

(٤) ابن حجر العسقلاني(ت: ٨٥٢هـ)، نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر، تحقيق: عبد الله بن ضيف الله الرحيلي، طبع:مطبعة سفير، ط/١ عام (١٤٢٢هـ)، الرياض، ص: ١١٢.

(٥) جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي (٨٤٩هـ/٩١١ هـ)، تحذير الخواص من أكاذيب القصاص، تحقيق: محمد الصباغ، طبع: المكتب الإسلامي، سنة ١٣٩٤هـ - ١٩٧٤م، بيروت، ص: ١/٦٩٠.

(٦) مقدمة ابن الصلاح: ، ص:٤٧، وفتح المغيث، ص:١/٢٤٨.

(٧) شرح ألفية العراقي: ، ص:١/٢٦١.

(٨) أبي سليمان حمد بن محمد بن إبراهيم بن الخطاب البستي المعروف بالخطابي (ت: ٣٨٨هـ)، معالم السنن، طبع: المطبعة العلمية، حلب، الأولى ١٣٥١ هـ - ١٩٣٢م ، ص: ١/١١، ومقدمة ابن الصلاح: (ص٤٧).

(٩) دكتور فتح الرحمن قرشي،"الأخبار الموضوعة في جامع للإمام التِرْمِذيّ (رحمه الله)"، المنشور في حولية الجامعةالإسلامية العالمية، إسلام آباد، العدد (١٧) لسنة: ٢٠٠٩م.

(١٠) قلتُ: تبيّن أنّ مجموع الأحاديث الصحيحة والحسنة التي انفرد بها ابن ماجه عن الكتب الخمسة، تساوي نصف ما انفرد به تقريباً، كما سيأتي نقله قريباً -إن شاء الله-تأكيداً لاستقراء ابن حجر.

(١١) أحمد بن علي بن حجر العسقلاني (ت: ٥٢٨ هـ)، تهذيب التهذيب ، طبع:دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، الطبعة الاولى (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م)، ص: ٩/٥٣١،
محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبي (ت٧٤٨هـ)، سير أعلام النبلاء ، تحقيق: شعيب الأرناؤوط، طبع: مؤسسة الرسالة، ط/الثالثة (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م)، بيروت، ص: ١٣/٢٧٨.

(١٢) تهذيب التهذيب ، ص:٩/٥٣٢.

(١٣) خلدون الاحدب، علم زوائد الحديث، طبع: دار القلم دمشق، تاريخ النشر: ١٩٩٢م، ص:١٨-١٩.

(١٤) محمد بن يزيد القزويني، سنن ابن ماجه، تحقيق: شعيب الأرناؤط، وآخرين، طبع: دار الرسالة العالمية، ص:٢٧/١.

(١٥) المرجع السابق ، ص:٢٨/١.

(١٦) أحمد بن أبي بكر بن البوصيري (ت: ٨٤٠هـ)، مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، تحقيق: محمد المنتقى الكشناوي، طبع: دار العربية ، ط/ ٢، ١٤٠٣ هـ، بيروت، ص:١٠/١.

(١٧) يوسف بن الزكي عبدالرحمن أبو الحجاج المزي، تهذيب الكمال في أسماء الرجال، تحقيق: د. بشار عواد معروف، طبع: مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى (١٤٠٠ هـ/١٩٨٠م)، بيروت، ص:٣٧٢/٢٦. وتهذيب التهذيب، ص:٤٣٠/٩.

(١٨) عبد الرحمن بن علي بن محمد بن الجوزي أبو الفرج (٥١٠هـ/٥٧٩هـ)، الضعفاء والمتروكون، تحقيق: عبد الله القاضي، طبع: دار الكتب العلمية، سنة ١٤٠٦هـ، بيروت، ص:٤٠/٣.

(١٩) عبدالله بن عدي بن عبدالله بن محمد أبو أحمد الجرجاني، (٢٧٧هـ/٣٦٥هـ)، الكامل في ضعفاء الرجال، تحقيق: يحيى مختار غزاوي، طبع: دار الفكر، سنة (١٤٠٩هـ - ١٩٨٨م)، بيروت، ص:٣٦٩/٧.

(٢٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١١/١.

(٢١) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٢٦٤/٢٥.

(٢٢) محمد بن أحمد الذهبي (٧٤٨هـ)، ميزان الاعتدال، تحقيق: علي محمد معوض، وعادل أحمد عبدالموجود، طبع: دار الكتب العلمية، سنة (١٩٩٥م)، بيروت، ص:٥٦٢/٣.

(٢٣) محمد ناصر الدين الألباني، سلسلة الأحاديث الضعيفة، طبع: دار المعارف، الطبعة الأولى سنة (١٤١٢هـ/١٩٩٢م)، الرياض، المملكة العربية السعودية، ص:٧٨٣/١٣.

(٢٤) محمد بن حبان بن احمد ابى حاتم التميمي البستي (٣٥٤هـ)، المجروحين، تحقيق: محمود ابراهيم زايد، طبع: دار المعرفة (١٤١٢هـ-١٩٩٢م)، بيروت، ص:٢٤٨/٢.

(٢٥) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٢/١.

(٢٦) انظر: تهذيب الكمال: ، ص:٧٣/١٨-٨٢، وسلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني ، ص:٢٩٦/٥.

(٢٧) أبى الفرج عبدالرحمن بن على بن الجوزي القرشى(٥١٠ هـ — ٥٩٧هـ)، الموضوعات، تحقيق: عبدالرحمن محمد عثمان، طبع: المكتبة السلفية، الطبعة الاولى (١٣٨٦هـ/١٩٦٦م)، المدينة المنورة، ص:١٢٨/١.

(٢٨) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٢١/١.

(٢٩) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٤٩٤/١٨.

(٣٠) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٧٨/٣.

(٣١) عبد الرحمن بن ابى حاتم الحنظلي الرازي (ت: ٣٢٧ هـ)، الجرح والتعديل، ط/الاولى، طبع: مجلس دائرة المعارف العثمانية بحيدرآباد الدكن، الهند (١٣٧١هـ ١٩٥٢م)، ص:٧٤/٦.

(٣٢) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي ، ص:١٥٧/٢.

(٣٣) راجع بحثي: "الأخبار الموضوعة في جامع للإمام التِرْمذيّ (رحمه الله)"، الحديث رقم (٩).

(٣٤) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٢٣٣/٩.

(٣٥) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٤٩٤/٣.

(٣٦) أحمد بن على بن شعيب النسائي (ت ٣٠٣ هـ)، الضعفاء والمتروكون، تحقيق: محمود ابراهيم زايد، طبع: دار المعرفة، الطبعة الاولى (١٤٠٦ هـ - ١٩٨٦ م)، بيروت، لبنان، ص: ٤٠.

(٣٧) المجروحين لابن حبان ، ص:٣٠٠/١.

(٣٨) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٣٦/١.

(٣٩) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٢٩٧/٢٨.

(٤٠) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٩٩/٨.

(٤١) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص:٩٦.

(٤٢) المجروحين لابن حبان ، ص:١٦/٣.

(٤٣) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٦٢/١.

(٤٤) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٢٨٠/٢٦، وتهذيب التهذيب ، ص:٤٠١/٩.

(٤٥) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي ، ص:٩٢/٣.

(٤٦) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:١٢٠/٤.

(٤٧) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٣٥٥/٧.

(٤٨) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص:ص: ٩٣.

(٤٩) المجروحين لابن حبان ، ص:٢٧٨/٢.

(٥٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٩٠/١.

(٥١) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٣٩٢/٢٧.

(٥٢) محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي (٦٧٣هـ/٧٤٨هـ)، المغني في الضعفاء، تحقيق: الدكتور نور الدين عتر، طبع: دار الكتب العلمية، ١٩٩٧م، بيروت ، ص:٦٥١/٢.

(٥٣) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٢٧٥/٨.

(٥٤) الضعفاء الكبير للعقيلي، ص:٢٠٤/٤.

(٥٥) الضعفاء الصغير للبخاري ، ص:ص: ١٢٨.

(٥٦) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص:٩٦.

(٥٧) المجروحين لابن حبان ، ص:١٣/٣.

(٥٨) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١١٠/١.

(٥٩) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٥٠٦/٢٢، وتهذيب التهذيب ، ص:١٨٢/٨.

(٦٠) المغني في الضعفاء ، ص:٤٣٩/٢.

(٦١) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٣٥٥/٦.

(٦٢) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٣٧٨/٦.

(٦٣) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٣٤٣/٣.

(٦٤) المجروحين لابن حبان ، ص:١٨٠/٢.

(٦٥) المغني في الضعفاء ، ص:٤٣٩/٢.

(٦٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:١١٨/١.

(٦٧) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٣١/١٥.

(٦٨) محمد بن اسماعيل البخاري(ت٢٥٦هـ/٨٦٩م)، التاريخ الكبير، تحقيق: عبد القادر عطا، طبع: دار الكتب العلمية، ط/ الأولى (١٤٢٢هـ/٢٠٠٢م)، بيروت، ص:١٠٥/٥.

(٦٩) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٧١/٥.

(٧٠) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص:٦٤)، والضعفاء والمتروكون للدارقطني ، ص:١٥٩/٢.

(٧١) المجروحين لابن حبان ، ص:٩/٢.

(٧٢) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٤٥/١.

(٧٣) الضعفاء الصغير للبخاري ، ص:٣٧. الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٣٣٤/٢.

(٧٤) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص:٢٨.

(٧٥) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٤٧/١.

(٧٦) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٤٠٣/٦.

(٧٧) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٤٦٣/٦.

(٧٨) المجروحين لابن حبان ، ص:١٧٨/٢.

(٧٩) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٥٦/١.

(٨٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٧/٢.

(٨١) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٣٧٢/٣٢)، وتهذيب التهذيب ، ص:٣٩٧/١١.

(٨٢) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٤٤٨/٤.

(٨٣) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٢١٧/٩.

(٨٤) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص: ١٠٦.

(٨٥) المجروحين لابن حبان ، ص:١٣٨/٣.

(٨٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٠/٢.

(٨٧) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:١٠٢/٣٣، وتهذيب التهذيب ، ص:٢٧/١٢.

(٨٨) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٢٧١/٢.

(٨٩) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٢٠٢/٩.

(٩٠) المجروحين لابن حبان ، ص:١٤٧/٣.

(٩١) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٢٠/٢.

(٩٢) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٥٦٧/٢٧، وتهذيب التهذيب ، ص:١٤٦/١٠.

(٩٣) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٢٦٨/٨.

(٩٤) التاريخ الكبير للبخاري ، ص:٣٨٩/٧.

(٩٥) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص: ٩٧.

(٩٦) سعدي بن مهدي الهاشمي، أبو زرعة الرازي وجهوده في السنة النبوية، طبع: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة النبوية، المملكة العربية السعودية، طبعة: ١٤٠٢هـ/١٩٨٢م، ص:٨٢٩/٣.

(٩٧) المجروحين لابن حبان ، ص:٣٣/٣.

(٩٨) ميزان الاعتدال ، ص:١٠٩/٤.

(٩٩) ابن أبي حاتم الرازي، عبد الرحمن بن محمد بن إدريس(ت: ٣٢٧هـ)، علل الحديث، تحقيق: د/ سعد بن عبد الله الحميد ود/ خالد بن عبد الرحمن الجريسي، طبع: مطابع الحميضي، ط/الأولى، ١٤٢٧ هـ ، ٢٠٠٦م، ص:٢١١/٦.

(١٠٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٤/٢.

(١٠١) الكامل في ضعفاء الرجال، ص:١٦١/٨.

(١٠٢) التاريخ الكبير للبخاري، ص:١١/٨.

(١٠٣) الضعفاء والمتروكون للدارقطني، ص:١٣٢/٣)، وميزان الاعتدال، ص:٤٣٣/٣.

(١٠٤) المجروحين لابن حبان، ص:٣٠/٣.

(١٠٥) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٩/٢.

(١٠٦) تهذيب التهذيب لابن حجر، ص:٤٧١/١٠.

(١٠٧) ميزان الاعتدال، ص:٢٧٢/٤، وتهذيب التهذيب، ص:٤٧١/١٠.

(١٠٨) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٤٩٠/٨.

(١٠٩) الكامل في ضعفاء الرجال، ص:٣٢٨/٨-٣٢٩.

(١١٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٨٠/٢.

(١١١) المغني في الضعفاء، ص:٦٠٦/٢، وتهذيب التهذيب، ص:٣١٠/٩.

(١١٢) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٣٢٥/٧. وانظر: تاريخ الإسلام للذهبي، ص:٩٦٢/٤.

(١١٣) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٨٤/٢.

(١١٤) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٤٠٣/٦.

(١١٥) الكامل في ضعفاء الرجال، ص:٤٦٣/٦.

(١١٦) المجروحين لابن حبان، ص:١٧٨/٢.

(١١٧) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٨٨/٢.

(١١٨) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٤٢٧/٢.

(١١٩) المجروحين لابن حبان، ص:٢٠٢/١.

(١٢٠) تهذيب التهذيب، ص:٤٢٣/١.

(١٢١) ميزان الاعتدال، ص:٢٩٩/١.

(١٢٢) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٩/٣.

(١٢٣) أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (ت: ٢٤١هـ)، العلل ومعرفة الرجال، (رواية ابنه عبد الله)، تحقيق: وصي الله بن محمد عباس، طبع: دار الخاني، ط/٢، (١٤٢٢هـ /٢٠٠١م)، الرياض، ص:٣٨٤/١.

(١٢٤) التاريخ الكبير للبخاري، ص:١٣١/٧.

(١٢٥) علل الحديث لابن أبي حاتم، ص:٨٠/٦.

(١٢٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٤١/٣.

(١٢٧) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٦٩/٢١.

(١٢٨) الكامل في ضعفاء الرجال، ص:٣٥٦/٦.

(١٢٩) محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، تاريخ الإسلام، تحقيق: د.عمر عبد السلام تدمري، طبع: دار الكتاب العربي، ط/ الأولى:١٤٠٧هـ ،١٩٨٧م، لبنان/بيروت، ص:٩٣٣/٣)، وميزان الاعتدال، ص:١٤٥/٣.

(١٣٠) المجروحين لابن حبان، ص:١٠٧/٢.

(١٣١) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٥٥/٣.

(١٣٢) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٢٦٩/٢٦.

(١٣٣) المغني في الضعفاء ، ص:٦٢٣/٢.

(١٣٤) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي، ص:٩١/٣. وميزان الاعتدال، ص:٣/٤.

(١٣٥) المجروحين لابن حبان، ص:٢٨١/٢.

(١٣٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٩٦/٣.

(١٣٧) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٤٩٦/٢٠.

(١٣٨) الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص:٧٧.

(١٣٩) المجروحين لابن حبان، ص:١٠٥/٢.

(١٤٠) علل الحديث لابن أبي حاتم ، ص:٦١١/٦.

(١٤١) الضعفاء الكبير للعقيلي، ص:٢٣٤/٣.

(١٤٢) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:١١٩/٣.

(١٤٣) انظر: تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:١٥٥/٤، والضعفاء الكبير للعقيلي، ص:١٣٨/١.

(١٤٤) العلل ومعرفة الرجال لأحمد، ص:٤٧١/٢. والجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٣٦٨/٢.

(١٤٥) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي، ص:١٤٤/١.

(١٤٦) المجروحين لابن حبان، ص:١٨٧/١.

(١٤٧) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:١٤٨/٣.

(١٤٨) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٢٦٤/٢٥.

(١٤٩) ميزان الاعتدال، ص:٥٦٢/٣.

(١٥٠) سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني، ص:٧٨٣/١٣.

(١٥١) المجروحين لابن حبان، ص:٢٤٨/٢.

(١٥٢) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:١٥٦/٣.

(١٥٣) وفي بعض المصادر: «صبح»، انظر: الضعفاء للعقيلي، ص:١٧٥/٣ ، الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:١١٦/٦ رقم ٦٢٩.

(١٥٤) ميزان الاعتدال، ص:٢٠٦/٣.

(١٥٥) الكامل في ضعفاء الرجال، ص:٤٧/٦.

(١٥٦) المجروحين لابن حبان، ص:٨٨/٢.

(١٥٧) عبد العظيم بن عبد القوي المنذري أبو محمد، الترغيب والترهيب، تحقيق: إبراهيم شمس الدين، طبع: دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، (١٤١٧هـ/١٩٩٦م)، بيروت، لبنان، ص:١٥١/٢.

(١٥٨) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٥٧/٣.

(١٥٩) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٤٠٢/١٠، وتهذيب التهذيب، ص:٢٠/٤.

(١٦٠) الضعفاء الكبير للعقيلي، ص:١٠٢/٢.

(١٦١) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:١٦/٤.

(١٦٢) تهذيب التهذيب، ص:٢٠/٤.

(١٦٣) ميزان الاعتدال، ص:١٣٢/٢.

(١٦٤) الترغيب والترهيب للمنذري، ص:١٥٤/٢.

(١٦٥) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٦٠/٣.

(١٦٦) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٤٤٣/٨.

(١٦٧) التاريخ الكبير للبخاري، ص:٢٤٤/٣.

(١٦٨) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٤٢٤/٣.

(١٦٩) الضعفاء والمتروكون للدارقطني ، ص:١٥٢/٢.

(١٧٠) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٤٦٣/٦.

(١٧١) المجروحين لابن حبان ، ص:٢٩١/١.

(١٧٢) الموضوعات لابن الجوزي ، ص:٥٥/٢-٥٦.

(١٧٣) ميزان الاعتدال ، ص:٢٠/٢.

(١٧٤) المجروحين لابن حبان ، ص:١٦١/٢.

(١٧٥) أحمد بن علي بن حجر العسقلاني (ت: ٨٥٢ هـ)، تقريب التهذيب، دراسة وتحقيق: مصطفى عبد القادر عطا، طبع: دار المكتبة العلمية بيروت، لبنان، ص:٣٥٤.

(١٧٦) ميزان الاعتدال، ص:٦٠٥/٢.

(١٧٧) الموضوعات لابن الجوزي، ص:٢٥٥/٢.

(١٧٨) علل الحديث لابن أبي حاتم، ص:١١٣/٣.

(١٧٩) سلسلة الأحاديث الضعيفة، ص:٢٣٢/٢.

(١٨٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٣٨/٣.

(١٨١) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:١٤١/٢٩. والضعفاء الكبير للعقيلي، ص:١٦٩/٤.

(١٨٢) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:١٦٠/٨.

(١٨٣) المجروحين لابن حبان، ص:٢٤١/٢.

(١٨٤) الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص:٩٥.

(١٨٥) الموضوعات لابن الجوزي، ص:١٤/٣.

(١٨٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٢/٤.

(١٨٧) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٤٠٣/٦).

(١٨٨) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:٤٦٣/٦).

(١٨٩) المجروحين لابن حبان ، ص:١٧٨/٢).

(١٩٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٢٥/٤).

(١٩١) الموضوعات لابن الجوزي ، ص:٢٦/٣).

(١٩٢) عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي(ت:٩١١هـ)، اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة، تحقيق: أبي عبد الرحمن صلاح بن محمد بن عويضة، طبع: دار الكتب العلمية، ط/١، ١٤١٧هـ/١٩٩٦م، بيروت، ص:٢٤٣/٢-٢٤٤.

(١٩٣) المجروحين لابن حبان ، ص:١١٩/٣.

(١٩٤) الكامل في ضعفاء الرجال ، ص:١٠٥/٩.

(١٩٥) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٤٢٧/٤.

(١٩٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:٢٩/٤.

(١٩٧) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٤٩٤/١٨.

(١٩٨) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٧٤/٦.

(١٩٩) التاريخ الكبير للبخاري ، ص:١٠٠/٦.

(٢٠٠) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٧٨/٣.

(٢٠١) المجروحين لابن حبان ، ص:١٤٨/٢.

(٢٠٢) علي بن عمر الدارقطني، الضعفاء والمتروكين، تحقيق: الشيخ عبدالعزيز عزالدين السيروان، طبع: دار القلم الطبعة الأولى (١٤٠٥ هـ)، بيروت، ص:١٦٢/٢.

(٢٠٣) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٣١/٤.

(٢٠٤) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٤٨/٣٠.

(٢٠٥) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٤٨٥/٨.

(٢٠٦) المجروحين لابن حبان، ص:٤٧/٣.

(٢٠٧) الموضوعات لابن الجوزي، ص:٣٠/٣.

(٢٠٨) اللآلئ المصنوعة السيوطي، ص:٢٤٦/٢. راجع: سلسلة الأحاديث الضعيفة، ص:٤١٤/١.

(٢٠٩) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٣٣/٤.

(٢١٠) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٦٩/٢١.

(٢١١) المجروحين لابن حبان، ص:١٠٧/٢.

(٢١٢) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:١٩٨/٦.

(٢١٣) ميزان الاعتدال، ص:١٤٥/٣.

(٢١٤) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٨٤/٤.

(٢١٥) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٣٩٢/٢٧.

(٢١٦) الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص:٩٦.

(٢١٧) المغني في الضعفاء، ص:٦٥١/٢.

(٢١٨) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:٢٧٥/٨.

(٢١٩) تاريخ ابن معين – رواية ابن محرز ، ص:٥٥/١.

(٢٢٠) الموضوعات لابن الجوزي ، ص:١٧٣/١.

(٢٢١) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، ص:١٩٥/٤.

(٢٢٢) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٤٩٥/١٠.

(٢٢٣) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي ، ص:٣٢١/١.

(٢٢٤) الضعفاء والمتروكون للنسائي ، ص:٥٢.

(٢٢٥) يحيى بن معين أبو زكريا (١٥٨هـ/٢٣٣هـ)، تاريخ ابن معين(رواية الدوري)، تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف، طبع: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي،(١٣٩٩هـ،١٩٧٩م)، مكة المكرمة، ص:٤٢٢/٤.

(٢٢٦) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٢٨/٤.

(٢٢٧) المغني في الضعفاء ، ص:٢٦١/١.

(٢٢٨) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:١٩٦/٤.

(٢٢٩) تهذيب الكمال في أسماء الرجال ، ص:٤٦١/٢٢.

(٢٣٠) الضعفاء الكبير للعقيلي ، ص:٣٢٨/٣.

(٢٣١) تهذيب التهذيب ، ص:١٧٣/٨.

(٢٣٢) ابن قيم الجوزي، محمد بن أبي بكر(ت: ٧٥١هـ)، المنار المنيف في الصحيح والضعيف، تحقيق:عبد الفتاح أبي غدة، طبع: مكتبة المطبوعات الإسلامية، ط/١(١٣٩٠هـ/١٩٧٠م)،حلب،ص:٤١

(٢٣٣) سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة، ص:٤٣٨/٤، بتصرف.

(٢٣٤) الموضوعات لابن الجوزي، ص:١٩٨/٣.

(٢٣٥) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٠٥/٤.

(٢٣٦) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٤٣٣/٢٠.

(٢٣٧) تهذيب التهذيب، ص:٣٢١/٧.

(٢٣٨) التاريخ الكبير للبخاري، ص:٩٥/٥.

(٢٣٩) محمد بن عبدالله أبو عبدالله الحاكم النيسابوري، المستدرك على الصحيحين، تحقيق: مصطفى عبد القادر عطا، طبع: دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى (١٤١١هـ/١٩٩٠م)، بيروت، لبنان، ص:٢٣٣/٣.

(٢٤٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٠٧/٤.

(٢٤١) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:١٣٦/٢٤.

(٢٤٢) المجروحين لابن حبان، ص:٢٢١/٢.

(٢٤٣) الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص:٨٩.

(٢٤٤) تاريخ ابن معين، رواية الدوري، ص:٢٣٢/٣.

(٢٤٥) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي، ص:٢٣/٣).

(٢٤٦) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٥٨/٤.

(٢٤٧) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ص:٢١٣/٣.

(٢٤٨) الضعفاء الكبير للعقيلي، ص:٩٦/١. و سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة، ص:١٠٨/٧.

(٢٤٩) الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي، ص:١٢٣/١.

(٢٥٠) علل الحديث لابن أبي حاتم، ص:٢٦٧/٥.

(٢٥١) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ص:٢٦٠/٤.

(٢٥٢) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ، ص:٤٠٣/٦.

(٢٥٣) الكامل في ضعفاء الرجال، ص:٤٦٣/٦.

(٢٥٤) المجروحين لابن حبان، ص:١٧٨/٢.

المصادر والمراجع

(١) الآثار المرفوعة في الأخبار الموضوعة: لعبد الحي اللكهنوي، دار الكتب العلمية، بدون تاريخ.

(٢) الأخبار الموضوعة في جامع للإمام التِرْمذيّ (رحمه الله): للدكتور فتح الرحمن قرشي، حولية الجامعة الإسلامية العالمية – إسلام آباد، العدد (١٧) لسنة: ٢٠٠٩م.

(٣) الإرشاد في معرفة علماء الحديث: للخليل بن عبد الله بن أحمد الخليلي القزويني أبو يعلى، تحقيق د. محمد سعيد عمر إدريس، مكتبة الرشد، الطبعة الأولى، ١٤٠٩هـ – الرياض.

(٤) تاريخ ابن معين (رواية الدوري): ليحيى بن معين أبو زكريا (١٥٨هـ/٢٣٣هـ)، تحقيق د. أحمد محمد نور سيف، مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي، (١٣٩٩هـ – ١٩٧٩م)، مكة المكرمة.

(٥) تاريخ الإسلام ووفيات المشاهير والأعلام، لشمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، تحقيق: د. عمر عبد السلام تدمري، دار الكتاب العربي، ط/ الأولى: ١٤٠٧هـ – ١٩٨٧م، لبنان/بيروت.

(٦) تحذير الخواص من أكاذيب القصاص: لجلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي (٨٤٩هـ/٩١١ هـ)، تحقيق محمد الصباغ، نشر المكتب الإسلامي، سنة ١٣٩٤هـ – ١٩٧٤م، بيروت.

(٧) تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي: لعبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي، تحقيق: عبد الوهاب عبد اللطيف، نشر مكتبة الرياض الحديثة – الرياض.

(٨) تقريب التهذيب: للحافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني (ت: ٨٥٢ هـ)، دراسة وتحقيق: مصطفى عبد القادر عطا، طبعة دار المكتبة العلمية بيروت – لبنان.

(٩) تهذيب التهذيب: للامام الحافظ شيخ الاسلام شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني (ت: ٥٢٨ هـ)، دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، الطبعة الاولى (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م).

(١٠) تهذيب الكمال: يوسف بن الزكي عبدالرحمن أبو الحجاج المزي، تحقيق: د. بشار عواد معروف، نشر مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى (١٤٠٠ هـ/١٩٨٠م)، بيروت.

(١١) التاريخ الأوسط: لمحمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة البخاري، (ت: ٢٥٦هـ)، تحقيق: محمود إبراهيم زايد، دار الوعي، مكتبة دار التراث، حلب – القاهرة، ط/ الأولى: ١٣٩٧هـ – ١٩٧٧م.

(١٢) التاريخ الكبير: لمحمد بن اسماعيل بن ابراهيم الجعفي البخاري (ت٢٥٦هـ/٨٦٩م)، تحقيق عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية، ط/ الأولى (١٤٢٢هـ/٢٠٠٢م)، بيروت.

(١٣) الترغيب والترهيب من الحديث الشريف: لعبد العظيم بن عبد القوي المنذري أبو محمد، تحقيق: إبراهيم شمس الدين، نشر دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، (١٤١٧هـ/١٩٩٦م)، بيروت – لبنان.

(١٤) الجامع الصحيح المختصر: لمحمد بن إسماعيل أبي عبدالله البخاري الجعفي، تحقيق: د. مصطفى ديب البغا، دار ابن كثير، الطبعة الثالثة، (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م)، بيروت.

(١٥) الجامع الكبير: للترمذي، تحقيق: بشار عوّاد، دار الغرب الإسلامي، ط/الأولى ١٩٩٦م، لبنان.
(١٦) الجرح والتعديل: لابي محمد عبد الرحمن بن ابى حاتم الحنظلي الرازي (ت: ٣٢٧ هـ)، ط/الاولى، مجلس دائرة المعارف العثمانية بحيدرآباد الدكن – الهند (١٣٧١هـ ١٩٥٢م).
(١٧) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: لأبي نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني، دار الكتاب العربي، الطبعة الرابعة (١٤٠٥هـ)، بيروت — لبنان.
(١٨) علم زوائد الحديث: لخلدون الاحدب، نشر: دار القلم دمشق، تاريخ النشر: ١٩٩٢م.
(١٩) علم زوائد الحديث: لعبد السلام علوش، دار ابن حزم للنشر والتوزيع (بيروت)، سنة: ١٩٩٥م.
(٢٠) سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الأمة: للشيخ محمد ناصر الدين، نشر دار المعارف، الطبعة الأولى سنة (١٤١٢هـ/١٩٩٢م)، الرياض – المملكة العربية السعودية.
(٢١) سنن ابن ماجه: لمحمد بن يزيد القزويني، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار الفكر، بيروت.
(٢٢) سنن ابن ماجه: تحقيق شعيب الأرناؤط، وآخرين، طبعة دار الرسالة ط/الأولى، ١٤٣٠هـ.
(٢٣) سنن الدارقطني: لعلي بن عمر أبو الحسن الدارقطني ، تحقيق: السيد عبد الله هاشم يماني المدني، دار المعرفة ، ١٣٨٦ هـ — ١٩٦٦م- بيروت.
(٢٤) سؤالات ابن الجنيد (ت٢٦٠هـ) للإمام أبي زكريا يحي بن معين (١٥٨هـ/ت٢٣٣هـ) تحقيق الدكتور أحمد محمد نور سيف) طبعة مكتبة الدار سنة (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م).
(٢٥) سؤالات البرذعي: لعبيد الله بن عبد الكريم بن يزيد الرازي أبو زرعة، تحقيق: د. سعدي الهاشمي، الناشر: الجامعه الاسلامية – المدينه المنورة، الطبعة الأولى ١٤٠٢هـ – ١٩٨٢م.
(٢٦) سير أعلام النبلاء: لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبي (ت٧٤٨هـ)، تحقيق شعيب الأرناؤوط، نشر مؤسسة الرسالة، ط/الثالثة (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م)، بيروت.
(٢٧) مسند الشهاب: لمحمد بن سلامة بن جعفر أبي عبد الله القضاعي، تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي، مؤسسة الرسالة، الطبعة الثانية، ١٤٠٧ — ١٩٨٦م، بيروت.
(٢٨) الضعفاء والمتروكين: للإمام أبي الحسن علي بن عمر الدارقطني، تحقيق: الشيخ عبدالعزيز عزالدين السيروان، نشر دار القلم الطبعة الأولى (١٤٠٥ هـ)، بيروت.
(٢٩) الضعفاء والمتروكين: للامام أحمد بن على بن شعيب النسائي (ت ٣٠٣ هـ)، تحقيق محمود ابراهيم زايد، دار المعرفة، الطبعة الاولى (١٤٠٦ هـ – ١٩٨٦ م)، بيروت — لبنان.
(٣٠) الضعفاء والمتروكين: لعبد الرحمن بن علي بن محمد بن الجوزي أبو الفرج (٥١٠هـ/٥٧٩هـ)، تحقيق عبد الله القاضي، الناشر دار الكتب العلمية، سنة ١٤٠٦هـ، بيروت.
(٣١) العلل: لأبي محمد عبد الرحمن بن محمد بن إدريس بن المنذر، ابن أبي حاتم الرازي (ت: ٣٢٧هـ)، تحقيق: د/ سعد بن عبد الله الحميد ود/ خالد بن عبد الرحمن الجريسي، مطابع الحميضي، ط/الأولى، ١٤٢٧ هـ – ٢٠٠٦م.

(٣٢) العلل المتناهية في الأحاديث الواهية: لعبد الرحمن بن علي بن الجوزي، تحقيق خليل الميس، نشر دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى (١٤٠٣هـ)، بيروت.

(٣٣) العلل ومعرفة الرجال: لأبي عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (ت: ٢٤١هـ)، (رواية ابنه عبد الله) تحقيق: وصي الله بن محمد عباس، دار الخاني ، ط/٢، (١٤٢٢هـ /٢٠٠١م)– الرياض.

(٣٤) فتح الباقي بشرح ألفية العراقي: لأبي يحيى زكريا بن محمد بن زكريا الأنصاري السنيكي (ت ٩٢٦ هـ)، تحقيق: عبد اللطيف هميم، وماهر الفحل، دار الكتب العلمية، ط١، ١٤٢٢هـ/٢٠٠٢م.

(٣٥) فتح المغيث بشرح الفية الحديث: لشمس الدين أبي الخير محمد بن عبد الرحمن السخاوي (ت:٩٠٢هـ)، تحقيق: علي حسين علي، مكتبة السنة ، ط/١، (١٤٢٤هـ/٢٠٠٣م) – مصر.

(٣٦) أبو زرعة الرازي وجهوده في السنة النبوية: لسعدي بن مهدي الهاشمي، نشر: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة النبوية، المملكة العربية السعودية، طبعة: ١٤٠٢هـ/١٩٨٢م.

(٣٧) الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة: للامام شمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد بن الذهبي الدمشقي (٦٧٣ – ٧٤٨هـ)، وحاشيته للامام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد سبط ابن العجمي الحلبي (٧٥٣ – ٨٤١ هـ) رحمهما الله تعالى، تحقيق: محمد عوامة، وأحمد محمد نمر الخطيب، دار القبلة للثقافة الاسلامية مؤسسة علوم القرآن، الطبعة الأولى (١٤١٣هـ/١٩٩٢م)، جدة.

(٣٨) الكامل في ضعفاء الرجال: لعبدالله بن عدي بن عبدالله بن محمد أبو أحمد الجرجاني، (٢٧٧هـ/٣٦٥هـ)، تحقيق: يحيى مختار غزاوي، دار الفكر، سنة (١٤٠٩هـ – ١٩٨٨م)، بيروت.

(٣٩) اللآلىء المصنوعة في الأحاديث الموضوعة: لعبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (ت:٩١١هـ)، تحقيق: أبي عبد الرحمن صلاح بن محمد بن عويضة، دار الكتب العلمية، ط/١، ١٤١٧هـ/١٩٩٦م، – بيروت.

(٤٠) مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه: لأبي العباس شهاب الدين أحمد بن أبي بكر بن البوصيري (ت: ٨٤٠هـ)، تحقيق: محمد المنتقى الكشناوي، دار العربية ، ط/ ٢، ١٤٠٣ هـ، بيروت.

(٤١) معالم السنن: لأبي سليمان حمد بن محمد بن إبراهيم بن الخطاب البستي المعروف بالخطابي (المتوفى: ٣٨٨هـ)، نشر: المطبعة العلمية – حلب، الأولى ١٣٥١ هـ – ١٩٣٢م .

(٤٢) معرفة أنواع علوم الحديث: لعثمان بن عبد الرحمن، أبي عمرو، تقي الدين المعروف بابن الصلاح (ت: ٦٤٣هـ)، تحقيق: نور الدين عتر، دار الفكر المعاصر، (١٤٠٦هـ-١٩٨٦م) – بيروت.

(٤٣) معرفة الرجال عن يحيى بن معين: لأبي زكريا يحيى بن معين (ت: ٢٣٣هـ)، تحقق: محمد كامل القصار، مجمع اللغة العربية – دمشق، ط/١: ١٤٠٥هـ، ١٩٨٥م.

(٤٤) ميزان الاعتدال في نقد الرجال: لشمس الدين محمد بن أحمد الذهبي (٧٤٨هـ)، تحقيق علي محمد معوض، وعادل أحمد عبدالموجود، نشر دار الكتب العلمية، سنة (١٩٩٥م)، مكان النشر بيروت.

(٤٥) المجروحين من المحدثين والضعفاء والمتروكين للامام الحافظ محمد بن حبان بن احمد ابى حاتم التميمي البستي (٣٥٤هـ)، تحقيق محمود ابراهيم زايد، طبع دار المعرفة (١٤١٢هـ-١٩٩٢م)، بيروت.

(٤٦) المستدرك على الصحيحين: محمد بن عبدالله أبو عبدالله الحاكم النيسابوري، تحقيق مصطفى عبد القادر عطا، نشر دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى (١٤١١هـ/١٩٩٠م)، بيروت – لبنان.

(٤٧) المسند الجامع الصحيح لأبي الحسين مسلم بن الحجاج بن مسلم القشيري النيسابوري: نشر دار الجيل بيروت + دار الأفاق الجديدة . بيروت.

(٤٨) المغني في الضعفاء: للإمام شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي (٦٧٣هـ/٧٤٨هـ)، تحقيق الدكتور نور الدين عتر، نشر دار الكتب العلمية، ١٩٩٧م، بيروت.

(٤٩) المنار المنيف في الصحيح والضعيف: لمحمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية (ت: ٧٥١هـ)، تحقيق: عبد الفتاح أبي غدة، مكتبة المطبوعات الإسلامية ، ط/١: (١٣٩٠هـ/١٩٧٠م) – حلب.

(٥٠) الموضوعات: لأبي الفرج عبدالرحمن بن على بن الجوزي القرشى (٥١٠ هـ – ٥٩٧هـ)، تحقيق عبدالرحمن محمد عثمان، المكتبة السلفية، الطبعة الاولى (١٣٨٦هـ/١٩٦٦م)، المدينة المنورة.

(٥١) الموطأ الإمام مالك (رواية محمد بن الحسن)، تحقيق الدكتور تقي الدين الندوي، نشر دار القلم، الطبعة الأولى (١٤١٣هـ/١٩٩١م)، دمشق.

(٥٢) الموقظة في علم مصطلح الحديث: للذهبي، تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعات الإسلامية – حلب، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

(٥٣) نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر: لابن حجر العسقلاني (ت: ٨٥٢هـ)، تحقيق: عبد الله بن ضيف الله الرحيلي، مطبعة سفير، ط/١ عام (١٤٢٢هـ) – الرياض.

****

المنهج اللغوىّ فى التفسير وتاريخه

Linguistic Methodology of Tafseer and its History

سعيد احمد *

ABSTRACT

The Holy Quran was revealed in Arabic Language, it is, therefore necessary to seek Arabic Diction to gain the direct guidance from it. The companions of Holy Prophetﷺ, Tabeen, and the reverent Imams strictly rebuked those interpreters who interpret the Holy Quran without having command over Arabic Language. The verses of Quran that are clear in comprehension, explicit and easy, do require the source of interpretation as "Arabic Diction". This method highlights the positive trends to Arabic Diction. But in the matter of ambiguity and resemblance in verses and deduction of Masael, this Diction will be given second priority. Mere Diction and Arabic Socio-Diction may not be titled as most authentic. Diction is not the 'last word.' The very first priority will be given to the verses of Quran, Hadith e Nabvi and Quotations of Companions of Holy Prophetﷺ.

The companions themselves were the native Arabs but they used to do consult some Quranic terms with the Holy Prophetﷺ. As time passed, some strayed sects and atheists ignored this positive trend (Tafseer-bil-Mathur), and accustomed a new trend of interpretation of Holy Quran i.e. depending upon Arabic Diction only so that they may endorse their own thoughts. It was a negative source of interpreting the Holy Quran i.e. only by Arabic Diction.

The present article explores its historical perspectives after evaluating its negative trends. The Motazila sect got this trend nourished. The representing interpretations of Holy Quran of this trend have been analyzed in this article. At the end, Molana Ameen Ahsan Islahi's approach to Diction and his Tafseer 'Tadabbur e Quran' has been evaluated.

Keywords: Arabic Language, Arabic Diction, Tafseer-bil-Mathur, Linguistic Methodology, Motazila

* سعيد احمد جنيوتى رئيس قسم اللغة العربية بكلية الحكومية تعليم الاسلام جناب نغرجنيوت

تعتبر معرفة لغة القرآن الكريم من أهم الأدوات لفهمه وتفسيره ، ولا يصح فهمه وتفسيره إلا بطريق فهم اللسان الذي نزل فيه ؛فلذا يجب على المفسر أن يكون على معرفة تامة بقواعد اللغة العربية وأصولها ودلالاتها،فكان حقا على من أراد فهم معانيه وإدراك مراميه ، أن يكون على جانب كبير من التمكن من اللغة العربية ، وإلا لا يقدر على شيئ من ذلك.

ويقول الدكتور السبت:

"المراد باللغة العربية التى تعد من أهم شروط المفسر معرفة مقاصد العرب من كلامهم وأدب لغتهم ، سواء حصلت تلك المعرفة بالسجية والسليقة ، كالمعرفة الحاصلة للعرب الذين نزل القرآن بين ظهرانيهم ،أم حصلت بالتلقى والتعلم كالمعرفة الحاصلة للمولدين شافهوا بقية العرب ومارسوا اللغة على طريقهم ، والمولدين الذين درسوا علوم اللسان ودوَّنوها،ولما كان القرآن كلامًا عربيّا كانت قواعد العربيّة طريقا لفهم معانيه، وبدون ذلك يقع الغلط وسوء الفهم لمن ليس بعربي بالسليقة.

ونعنى بقواعد العربية : مجموع اللسان العربي ، وهى متن اللغة ، والتصريف والنحو والإشتقاق والغريب والإعراب والمعانى والبيان والبديع ومن وراء ذلك استعمالات العرب فى كلامها ، ووجوه مخاطبتها. " [1]

ومما لايختلف فيه اثنان أن للعلم بأصول اللغة العربية وللمعرفة بفروعها أهمية بالغة فى فهم وتفسيره والتسلح بهذا العلم يعتبر من أوجب شروط المفسر وأكمل آدابه ، فإن القرآن الكريم نزل بلسان عربي مبين ، ويتوقف فهمه على معرفة مفردات الألفاظ ومدلولاتها بحسب الوضع.

يقول الإمام الزركشى :

"وقد أنكر السلف إنكاراشديدًا على من تجرأ على التفسير دون أن يكون عالما باللغة العربية"

قال الإمام دار الهجرة مالك رحمه الله: "لا أوتى برجل يفسر كتاب الله غير عالم بلغة العرب إلا جعلته نكالاً"(٢)

وقال تلميذ ترجمان القرآن مجاهد رحمه الله : "لا يحل لأحد يؤمن بالله واليوم الآخر أن يتكلم فى كتاب الله إذا لم يكن عالما بلغات العرب "(٣)

ومع هذه المكانة السامية للغة وتلك المنزلة العالية لمعرفة أصولها، لا يجوز لمن يتصدى لتفسير القرآن الكريم أن يكون اعتماده فيه على مجرد اللغة فقط؛ لأنه يؤدى إلى تعطيل كثير من المفاهيم الدينية والمعانى الشرعية الثابتة بالقرآن والسنة وإجماع الأمة.

وفى ذلك يقول الحربى:

"ومن قواعد التفسير أنه "ليس كل ما ثبت فى اللغة صح حمل آيات التنزيل عليه ، بل يجب حمل كلام الله على الأوجه اللغوية والإعرابية القوية المشهورة دون الضعيفة والشاذة والغريبة ، اللائقة بالسياق والموافقة لأدلة الشرع"(٤)

فظهر من العبارات السابقة انّ الرجوع إلى اللغة العربية فى تفسيرالقرآن ليس مذمومًا. ولكن أنكر السلف على الذين اتخذو اللغة أساسًا ومدارًا ومناطًا لتفسير القرآن الكريم لا يحيدون عنها ولا ينصرفون إلى غيرها ولا يعتمدون على أسباب أُخرى لتوضيح القرآن الكريم مثلًا توضيح القرآن بالقرآن "لغة القرآن" وتبيين النبى ﷺ وتفسير الصحابة رضى الله عنهم وأقوال التابعين رحمهم الله ، ليس الرجوع إلى اللغة فى تفسير القرآن مذمومًا ولكن أنكر السلف الّذين يصرفون الآية عن ظاهرها إلى معان خارجة محتملة يدل عليها القليل من كلام العرب ولا توجد غالبا إلا فى الشعر ونحوه ويكون المتبادرخلافها.

وكذلك ليس المراد بالمنهج اللغوى ، واللغويين فى هذا البحث الرجوع إلى اللّغة فى تفسير القرآن الكريم،بل أعنى الّذين يفسرون القرآن من وجهة نظرهم تاييدًا لآراهم الباطلة وأفكارهم الفاسدة.

نذكر أولا مفهوم اللغة وبعد ذلك يوضح المنهج اللّغوى وتاريخه.

مفهوم اللغة عند اللغويين

قال الجوهرى:

"اللغة أصلها لُغَىٌ أو لُغَوٌ- والهاء عوضٌ، وجمعها لُغىً مثل بُرَة وبُرًى ولغات ايضا، وقال بعضهم سمعت لَغَاتَهُمْ بفتح التَّائِ- وشبّهها بالتاء الّتى يوقف عليها بالهاء والنسبة إليها لغوىٌ ولا تقل لَغَوِىٌّ ". (٥)

وقال نصر الهورينى:

"اللغى جمع لغة من لغا بالشيئ لهج به، ولغوت بكذا لفظت وتكلمت به حدفت اللام وعوض عنها الهاء وأصلها لغوة بالضم كغرفة. واللغة فى تعارف حملة الشريعة عبارة عمّا حفظ من كلام العرب الخلص ونقل عنهم من الألفاظ الدّالة على المعانى وأمّا تفسيرها بانها أصوات يعبّرها كل قوم عن أغراضهم فغير مراد لأن المطلوب هنا تعريف اللغة الواقعة فى كلام المؤلف وهى لغة العرب البلغاء لا مطلق اللغة وهذا تفسيرلمطلق اللغة وليس الكلام فيه-" (٦)

تعريف علم اللغة اصطلاحًا

"فهو علم يبحث فيه عن مفردات الألفاظ الموضوعة من حيث دلالتها على معانيها بالمطابقة" (٧)

الإمام السيوطى خلال بحثه عن اللغة ومفهوم الصحيح الثابت المحفوظ، ينقل أقوال العلماء فى حد اللغة:

"قال ابوالفتح ابن جنى فى الخصائص:حد اللغة أصوات يعبر بها كل قوم عن أغراضهم ثم قال واما تصريفها فهى فعلة من لغوت أى تكلمت وأصلها لغوّ ككرة وقلة وثبة كلّها لاماتها واواتٌ وقالوا فيها لغات ولغون كثبات وثبون وقيل منها لغا يلغىٰ إذا هذىٰ قال:

"ورب أسراب حجيج كظم عن اللغا ورفث التكلم"

وكذلك اللغو فى قوله تعالى:﴿وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً﴾ (٨) أى بالباطل وفى الحديث "من قال فى الجمعة صه فقد لغا" أى تكلم انتهى كلام ابن الجنى وقال امام الحرمين فى البرهان اللغة من لغا يلغى من باب رضى إذا لهج بالكلام" (٩)

المنهج اللغوىّ فى التّفسير

أما العلم باللغة العربيّة لغةالقرآن فإنه لا مراء بأن الصحابة رضى الله عنهم هم أهل اللغة المتقنون لها سليقة لا تعلماً ، فطرة لا تصنعاً ، طبعاً لا كسباً وكان الصحابة على ذروة الفصاحة وقمّة البلاغة ، عارفين أساليب اللغة ورموزها عالمين سعتها واسرارها وكانوا فى عصر النبى ﷺ وبعده يقرء ون القرآن أو يسمعونه فيعنون بتفهم روحه فان عنى علماء هم بشئ وراء ذلك فما يوضح الآية من سبب للنزول، واستشهاد بأبيات من أشعار العرب تفسر لفظاً غريباً ، أو أسلوباً غامضاً ولكنا لا نعلم فى العصر الأوّل ،إنحياز الصحابة إلى مذاهب دينيّة وآراء فى الملل والنحل ، فلما وقع هذا التفرّق الّذى تشتت منهج الصحابة رضى الله عنهم رأينا كل فرقة من هذه الفرق تنظر إلى القرآن من خلال عقيدتها وتفسره بما يتلاوم مع مذهبها ، فالمعتزلى يطبق القرآن على مذهبه فى الاختيار والصفات والتحسين والتقبيح العقليين ويؤوّل ما لا يتفق مذهبه وكذلك الشيعىّ وغيرذلك.

اهميّة المنهج اللغوىّ لدى المعتزلة

تفسير القرآن بظاهر العربية من غير استظهار بالسماع والنقل فيما يتعلق بغرائب القرآن ومافيه من الالفاظ المبهمة والمبدلة ومافيه من الاختصار والحذف ، والاضمار ، والتقديم والتاخير ، فمن لم يحكم ظاهر التفسير وبادر إلى استنباط المعانى بمجرد فهم العربية ، كثر غلطه ودخل فى زمرة من فسر القرأن بالرأى هذا هو المنهج الذى اختاره المعتزلة.

يقول الدكتور محمد حسين الذهبى:

"..... نجد المعتزلة قد حرصوا كلّ الحرص على الطريقة اللغوية الّتى تعتبر عندهم المبدأ الأعلى لتفسير القرآن وهذا المبدأ اللغوى يظهر اثره واضحاً فى تفسيرهم للعبارات القرآنية الّتى لا يليق ظاهرها عندهم بمقام الألوهية أوالعبارات الّتى تحتوى على التشبيه ، أوالعبارات الّتى تصادم بعض أصولهم فتراهم يحاولون أوّلاً إبطال المعنى الّذى يرونه مشتبها فى اللفظ القرآنى ثم يتتبون لهذا اللفظ معنى موجودا فى اللغة يزيل هذا الاشتباه ويتفق مع مذهبهم ويستشهدون على ما يذهبون إليه من المعانى الّتى يحملون ألفاظ القرآن عليها بادلة من اللغة والشعر العربى القديم،ثم إنّ المعتزلة بناء على رأيهم فى الاجتهاد ، من أن الحكم ما أدّى اليه اجتهاد كل مجتهد ، فاذا اجتهدوا فى حادثة فالحكم عندالله تعالى فى حق كل واحد مجتهده رفضوا أن يكون لآية التى تحتمل أوجها تفسيراً واحداً لاخطأ فيه وحكموا على جميع محاولاتهم التى حاولوها فى حلّ المسائل الموجودة فى القرآن بانها مرادة لله تعالى أو غاية ما قطعوا به هو عدم إمكان التفسير المخالف لمبادئهم وآرائهم، غاية الأمر أن المفسّر يقول باجتهاد والمجتهد قد يخطئ وقد يصيب وهو ما جور فى الحالتين وان كان الاجر على تفاوت". (١٠)

منهج المعتزلة فى تفسير القرآن

قام المعتزلة فى مطالع القرن الثانى للهجرة عند ما بدأت الأفكار الجديدة تسلل إلى العقول والحق أن طاقة العقل محدودة بحدود الزمان والمكان فانه لايمكن له أن تصور ما ورآء عالمه الذى يعيش فيه تصورًا صحيحًا إن كل من قايس هذه المسائل الغيبية الواردة فى الاية القرآنية ونحوها على محض العقول وحاكمها إلى المعلومات المشاهدة المحسوسة لم يهتد فيها إلى الصواب.

يقول الدكتور محمد زغلول سلام:

"ونشأت جماعة من علماء المسلمين ، تسلحوا بمناهج عقلية ، وعرفوا بقوة البيان وحسن الرأى ونفاذ البصيرة ، وقوة الحجة ، وعلى رأسهم المعتزلة ، وكبيرهم واصل بن عطاء وصاحبه عمرو بن عبيد ، وكان واصل صاحب بيان رائع ، وقدم راسخة فى البلاغة ، وكان داعية من كبار الدعاة آمن بمذهبه فقام يدعو إليه ويدافع عن القرآن والإسلام دفاعاً لا يعتمد كله على السنة ، ولا شاهد القرآن ، لأن أعدائه لم يعترفوا بهما ، بل اتخذ لنفسه منهجاً عقليّاً خلطه بالفلسفة ، وجمع من حوله جماعة من تلاميذه علمهم البيان وزودهم بالمنهج الذى أقامه وسار عليه ، وأرسل بهم إلى الأقاليم يجادلون أصحاب الديانات والبدع"[١١]

والإمام ابن قتيبة يبيّن منهج واصل ابن عطاء واصحابه ضدّ أهل السنة قائلا:

"وعلى منهج واصل بن عطاء سار صاحبه عمرو بن عبيد ، وكان رجلاً صالحاً زاهداً وكان كثيراً ما يصطدم بآرائه مع أهل الحديث والسنة ، فيتهمهم بأنهم أرجاس أنجاس أموات غير أحياء ويتهمونه بأنه صاحب هوى يمنعه من قول لصدق فيما ينقل". [١٢]

يقول الجاحظ:"كان داعية مقالة ورئيس نحلة "[١٣]ويقول: "ولأبى حذيفة واصل بن عطاء خطب محفوظة ورسائل مخلدة". [١٤]

عند ختام البحث يوضح دكتور زغلول سلام منهج واصل بن عطاء وطريق استدلاله وقياسه ويذ كر أعلام العتزلة وحاملى فكرهم ومتأثريهم تأثر بالغًا "وظلت حياته كفاحاً من أجل القرآن والإسلام ، ومن القرآن استمد بلاغته وأقام من نفسه متكلماً بما فيه من معانى العدل والتوحيد ، يحسن فهم النصوص ويحسن التعبير عن تلك المعانى ، ببحثه فيما وراء الألفاظ من معان وصور ذهنية مجردة ، وخلف واصل فى تفسير القرآن على مذهبه كتاباً أسماه معانى القرآن.وجدير أن يكون تفسير واصل صورة أولى لكتب التفسير التى خلفها لنا المعتزلة ، يحمل خلاصة أفكاره الإعتزالية ويعبر عن آرائه البيانية فى أسلوب القرآن فى نطاق عقله الحر ، الذى لا يحكم المنقول تحكيما جامداً ، بل يوازن بين المنقول والمعقول فى حدود المعنى العام للنص. وحمل لواء الاعتزال بعد واصل وعمرو وكثيرون من علماء اللغة والبيان ، ومنهم من اتخذ الإعتزال مذهباً يدين به ،وتصطبغ به كتبه وآراؤه ، ومنهم محمد بن المستنير قطرب النحوى ، وأبو الهذيل العلاف وبشر بن المعتمر والنظام والجاحظ.ومنهم من اكتفى من الاعتزال بمنهج البحث ، وحرية الرأى والفكر ـودقة النظر فى الأمور ـومن هؤلاء الأخفش سعيد بن مسعدة ، والمازنى ، والفراء وغيرهم. " (١٥)

أهم كتب التفسير على المنهج اللغوى:

النّظام وبيان القرآن

بيان القرآن من الصور الأولى لكتب التفسير الّتى خلّفها لنا المعتزلة ولكن قد اختلفت عن نظرته كثير من أصحابه من المعتزلة لانه كان يميل إلى حرية الرأى والفكر كان يظن الظن ثم يقيس عليه وينسى أن بدأ أمره كان ظنّا حتى تلميذه الجاحظ ينقد على بعض آرائه.

يقول الجاحظ:

"قرأ النّظام كتب الفلاسفة ودرس الاعتزال ،واتصل بالثقافة الهندية والفارسية واليونانية وتعلم المسيحية ولا هوتها ، وكان يميل فى علمه إلى التجربة والقياس ، ولا يقبل التسليم بالمنقول والمأثور ، ويعيب عليه الجاحظ تماديه فى القياس فيقول: "...وإنما كان عيبه الذى لا يفارقه سوء ظنه وجودة قياسه على العارض والخاطر والسابق الذى لا يوثق بمثله فلو كان بدل تصحيحه القياس التمس تصحيح الأصل الذى قاس عليه أمره على الخلاص ، ولكنه كان يظن الظن ثم يقيس عليه وينسى أن بدء أمره كان ظنيّاً،وألمّ بالثقافة العربية فحفظ القرآن ونظر فيه وفى تفسيره على ضوء مذهبه التجريبى القياسى وقاده هذا المذهب إلى للشك فى الحديث وفى آراء المفسرين". (١٦)

يقول الدكتور الذهبى:

"وكان النظام معتبراً فى مدرسة المعتزلة من الرؤوس الحرّة الواسعة الحرية وقد ذكر لنا تلميذه الجاحظ قوله الّذى قاله فى شان هولاء المفسرين." (١٧)

يقول الجاحظ:

كان ابو اسحاق يقول:"لا تستر سلوا إلى كثير من المفسرين وإن نصوا أنفسهم للعامة وأجابوا فى كل مسألة فان كثيراً منهم يقول بغير رواية على غير أساس وكلما كان المفسّر أغرب عندهم كان أحبّ اليهم وليكن عندكم عكرمة ، والكلبى والسدى والضحاك ، ومقاتل بن سليمان وابوبكر الأصمّ وقد قالوا فى قوله عزوجل: ﴿وَأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰه﴾(١٨) إن الله عزوجل لم يعن بهذا الكلام مساجدنا التى نصلّى فيها بل إنما عنى الجباه وكل ما سجد الناس عليه من يد وجبهة وانف وثفنة ـ وقالوا فى قوله تعالى:﴿أَفَلَا يَنْظُرُوْنَ إِلَى الإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (١٩) إنّه ليس يعنى الجمال والنوق وإنما يعنى السحاب". (٢٠)

١ مجاز القرآن

مجاز القرآن يمثل التيار اللغوى للتفسير وتوجد به بعض آثار البحث البيانى الّذى اتسع من بعد وهو يهمنا من هذه الناحية (المنهج اللغوى)

يقول الحربى:

"مجاز القرآن لإبى عبيدة معمر بن المثنى يعد من أشهر الكتب فى تطبيق هذا المنهج اللغوى فى التفسير ولن نبالغ لو قلنا أنه يعتبر من أهمّ مظان النماذج والامثلة التطبيقية المتمثلة فى منهج التمسك باللغة حيث جعل صاحبه ، القرآن نصاً عربياً مجرداً ولم يراع فى تفسيره سياق الأيات ولا أسباب النزول ولا المعانى الشرعية الّتى تدل عليها الفاظ القرآن ولا ما اثر من التفسير عن الصحابة والتابعين ولا عادات المخاطبين بهذا القرآن ، جرّد تفسيره للايات من هذا كله ونزله على المعانى العربية دون أن يحتكم إى غير استعمال العرب للالفاظ والتراكيب وقد أنكر عليه هذا المنهج جماعة من تلاميذه ومعاصريه ومن بعدهم". (٢١)

تحليل الكتاب

يقول محمد زغلول سلام :

"يحسن بنا أن نقف وقفة قصيرة أمام مجهود أبى عبيدة لاعتبارات كثيرة أحدها أنه أول دراسة تصلنا فى هذا الميدان اللغوى فى القرآن ، ثانيها أنه يعتبر مرحلة أولية من مراحل تطور النقد ، والدراسات البيانية فى أسلوب القرآن ، وفى الأدب العربى عامة ، وثالثها أن هذا الكتاب كان مرجعاً لكثير من الدراسات اللغوية والأدبية التى تلت ، لأن الرجل علم من أعلام اللغة والأدب فى القرنين الثانى والثالث ، ولا يصح إغفال إنتاجه فى دراسة متعلقة بالقرآن.يقدم أبو عبيدة لكتابه بمقدمة فى بحوث لغوية عامة فى القرآن يبدؤها ببحث كلمة " القرآن" وله رأى خاص فى

اشتقاق هذه الكلمة ينقله عنه لامتأخرون، وهو قوله: ((إنما سمى القرآن لأنه يجمع السور فيضمها ، وتفسير ذلك الأية فى القرآن ، قال الله جل ثناؤه: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَه وَقُرْاٰنَه﴾[٢٢] ويستشهد عليه من كلام العرب.وبعد أن ينتهى من تلك المقدمة العامة التى رسم فيها منهجه ، ووضع فكرته التى دار عليها الكتاب ، ثم خط الخطوط الأولى التى ستجرى عليها كلمة مجاز ، بعد هذا كله يبدأ بتناول السور والآيات تناولا تنازليّاً يبدأ بسورة الفاتحة ، ويتبع فى تفسيره نظاماً معيناً لا يكاد يحيد عنه". [٢٣]

نلخصه فيما يلى:

١ـ يبدأ شرح الآية بآية أخرى ما أمكن

٢ـ يتبعها بحديث فى نفس المعنى

٣ـ ثم يتبعهما بالشاهد الشعرى القديم ، أوبكلام العرب الفصيح ، كالخطب والأمثال والأقوال المأثورة ، ويحرص أبو عبيدة على أن يؤكد دائماً صلة أسلوب القرآن وفنون التعبير فيه بأساليب العرب وفنونهم ، فيذكر دائماً فى ختام كلامه أن العرب تفعل هذا.

وخلاصة القول فى كتاب المجاز أنه كان خطوة فى سبيل الكلام فى طرق القول أو "المجاز" بمعناه العام ، وقد حاول أن يكشف عن بعض ما جاء من ذلك فى أسلوب القرآن ، مع مقارنته بما جاء فى الأدب العربى. وساعد عليه محصوله الغزير فيه.

معانى القرآن للفرّاء

معانى القرآن وهو أشد وأدهى فى السير على هذا المنهج واستفاد صاحبه من "مجاز القرآن"إلى حد كبير حتى قيل إنه نسخة مغيرة من كتاب أبى عبيدة.

يقول دكتور زغلول سلام:

"يعتبر معانى القرآن للفراء دراسة مكملة من الناحية اللغوية لكتاب مجاز القرآن لأنه يبحث فى التراكيب والإعراب ، والمجاز يبحث فى الغريب والمجاز ، وكلتا الدراستين متعلقتان بالأسلوب ، واختلفت دراسة الفراء هنا عن دراسة أبى عبيدة ، وكان لهذا الخلاف أسبابه التى سنراها عما قليل، واسم الكتاب معانى القرآن لم يكن أول اسم أطلق على كتاب فى دراسات من هذا النوع كما كان المجاز مثلا ـ فيما نعلم". (٢٤)

ويبدأ بتفسير القرآن سورة ـ سورة بعد مقدمة قصيرة ـ بترتيب تنازلى يشرح ما فى الآيات من الغريب والإعراب والقراء ات شروحاً مختلفة ،لغوية ونحوية وأخبارية وأدبية.وقد يبين أسباب النزول ثم يسند كلما وجد إلى السند سبيلاً. " (٢٥)

ويقول احمد امين باحثا عن منهجه

"ويرى أحد الباحثين أن الفراء أول من تناول تفسير القرآن بترتيب السور معتمداً على نص لابن النديم ليس قاطعاً ، كما أن كتاب" المجاز"ينفى هذا الظن أويشكك فيه ". (٢٦)

منهج الكتاب

دكتور زغلول سلام يلقى الضوء على منهج الكتاب مفصلًا

"يبدأ بسورة الفاتحة ثم البقرة وهكذا تنازليّاً ، ويتعرض لآيات كل سورة آية آية بالترتيب فلم يقتصر على الغريب كما فعل أبو عبيدة شارحاً ومفسراً لغريب الألفاظ ويقف كلما استدعاه للوقوف، لقراءة فى آية يصححها أوينفيها أويضعها،ثم يفسرها تفسيراً نحويّاً ويوجه ما يحتاج منها إلى التوجيه النحوى أو اللغوى. ويأتى بالأمثلة والشواهد ثم يدرج المسألة جميعاً تحت قاعدة عامة. ويتبع فى تفسير الغريب قاعدة واحدة هى التى اتبعها أبو عبيدة من قبل تلك هى شرح اللآية بالآية ، ثم بالحديث إذ تسى ذلك ، ثم بالشاهد الشعرى أو المثل ، أو

الكلام الفصيح. وإذا تعرض لأسباب النزول فإنما يروى بالسند عن أئمة المفسرين من الصحابة والتابعين ـومثال ذلك من الكتاب :

تفسيره للآية: ﴿أَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْدَه﴾[٢٧] فيقول : قرأها يحي بن وثاب وأبو جعفر المدنى: ﴿أَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عِبَادَه﴾ على الجمع ، وقرأها الناس ـ عبده ـ ، وذلك أن قريشا قالت للنبى ﷺ: ما تخاف أن تحملك آلهتنا لعيبك إياها فأنزل الله تبارك وتعالى "أليس الله بكاف عبده" محمداً ﷺ فكيف يخوفونك من دونه ؟ والذين قالوا عباده قالوا قد همت أمم الأنبياء بها ووعدهم مثل هذا فقالوا لسيّدنا هود: ﴿إِنْ نَقُوْلُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْءٍ﴾ [٢٨] فقال الله تبارك وتعالى: ﴿أَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْادَه﴾ ، أى محمداً والأنبياء قبله ﷺ وكلّ صواب" [٢٩]

أشهر كتب التفسير الإعتزالى على المنهج اللّغوى:

ذكر الدكتور محمد حسين الذهبى كتب التفسير الإعتزالى كلّها الّتى الّفت من ابتداء فتنة اللإعتزال إلى العصر الحاضر واحصى أسماء جميع التفاسير ومؤلفيها اختصاراً فقال :

"نتصفح طبقات المفسرين للسيوطى وطبقات المفسرين لتلميذه الداودى وغيرهما من الكتب الّتى لها عناية بهذا الشّان فنجد أنّ من أشهر من صنف فى التفسير من المعتزلة ابوبكر ، عبدالرحمان بن كيسان الاصمّ المتوفى٢٢٠هـ أقدم شيوخ المعتزلة إنه ألّف تفسيراً للقرآن الكريم ، ولكنا لا نعلم عن هذا التفسير خبراً حيث أنه فقد بمرور الزّمن وتقادم العهد عليه[٣٠]

وهكذا ذكر أحد عشر تفسيراً مع ذكر اسم مؤلّفيها ونبذة يسيرة من منهجها، ويقول:

"ولم تكن هذه التفاسير أكثر حظاً من غيرها من كتب التفسير المختلفة حيث امتدّت إلى كثير منها يد الزمان ، فضاعت بتقادم العهد عليها

وحرمت المكتبة الاسلامية العامة من معظم هذا التراث العلمى الّذى لوبقى إلى يومنا هذا لا لقى لنا ضواً واضحاً على مدى التفكير التفسيرى لشيوخ هذا المذهب الاعتزالى ولكشف لنا عن حقيقة ما ينسب لبعض شيوخهم من تفسيرات واسعة النطاق ، نسمع بها من علمائنا المتقدمين ، ونقف منها موقف الحائر بين الشك واليقين لما يذكر عنها من الاستفاضة والتضخم إلى حدّ يكاد يكون متخيّلاً أو مبالغاً فيه" (٣١)

فظهر من هذه العبارة المذكورة إنه لم يصل إلينا منها إلاّ هذه المصنفات الثلاثة وهؤلاء أشهر من عرفناهم من مفسّرى المعتزلة.

١ـ تنزية القرآن عن المطاعن للقاضى عبدالجبار

٢ـ وامالى الشريف المرتضى

٣ـ والكشاف للزمخشرى

تفسير تدبر قرآن ومنهج الشيخ امين اصلاحى فى تحقيقه اللغوى، وفى العصر الحاضر جدّد هذا المنهج اللغوى الاستاذ حميد الدين فراهى رحمه الله صاحب نظام القرآن الذى كان وحيد عصره فى معرفة اللغة ثم اخذ عنه تلميذه الشيخ امين احسن اصلاحى:

قد عنى الشيخ عناية خاصة باللّغة العربية ـفهى أساس لفهم القرآن الكريم فى نظره وقدذكرها الإصلاحى فى مقدمة تفسيره ضمن الوسائل الداخلية لفهم القرآن الكريم،حيث قال:

"اللغة العربية التى نزل بها القرآن الكريم هى التى توجد فى كلام شعراء الجاهلية مثل أمرئ القيس وعمرو بن كلثوم وزهير ولبيد وفى كلام خطباء الجاهلية مثل قس بن ساعدة ونحوه ،وليست بتلك التى كان يستعملها المتنبى أوالحريرى ولا هى بلغة تصدرها الصحف والجرائد فى بلاد مصر والشام مثلا،ولذا لابد لكل من يريد أن يتذوق بلاغة القرآن فى ايجازه واعجازه أن

يمارس كلام شعراء أو (خطباء) الجاهلية وبدون تذوق كلامهم لايمكن إدراك محاسن لغة القرآن ولايستطيع أن يدرك ذلك السحر الذى أعجز كل بليغ وفصيح من مناقشة هذا الكتاب". (٣٢)

ولكننا نعترف مجهودات الأستاذ امين احسن أصلاحى ونشيّد بها ونرحّب بها لأنه قد سدّ هذا الباب المفتوح لكل من يدخل منه إلٰى تفسير القرآن على ميل هواه وجعله تحت النظريات التى نسقها دون الإمعان فى روح القرآن ونشلانه ولكن مع ذلك نجد أنه فتح بابا أخر لم ينبه إليه أثناء ذلك وهو أنه إن كان جعل كلام العرب مصدرًا موثوقًا ومرجعًا قطعيًّا لا كلام فى صحته ولا محل للإمتراء فيه ولكن جعل الأحاديث وآثار الصحابة مصدرا ظنيًا وخاصة حيثماجعل فيها الشكوك والشبهات ويطلقها دون الوصول إلى النتائج المتوصلة إليها وهذا يسير بنا إلى باب الإلحاد.

الشيخ أمين أحسن أصلاحى وكان قد أفاد بهذا التفسير القرآنى منهج القرآن كثيرا جدّا ولكن مع ذلك تولدت فكرة سلبيّة عنه عند من جاء بعده ولم يفكر الظروف الّتى الجأته ان يجعل القرآن أصلا ولم يقصد بذلك اهمال الحديث.

خلاصة الكلام:

ظلّ المتقدّمون يفسّرون من كلام العرب ويرجعون إليه دون تردد واضطراب وكانوا متمسّكين بذلك ومعترفين به ،ولكن الذين جاؤا بعد ذلك قلّ اهتمامهم بكلام العرب أسندوا على ذلك حتٰى وصل الأمر إلٰى بعض المفسّرين الذين فسّروا القرآن الكريم على نظرياتهم الّتى وضعوها واخترعُوها بأنفسهم، دون الرجوع إلىٰ كلام العرب وعدم الإعتناء بلغة قريش،وانصبّ إهتمامهم على الأبيات النّادرة والشاذّة وبنوا عليها نظرياتهم التى أحيانا تخالف روح القرآن وعلى المضئ قدمًا سارواعلى ذلك حتٰى أنكروا بعض الأخبار السماويّة والمعجزات القرآنيّه التى لامحل فيها للشك ولامقام للإمتراء قد أطلقوا ألسنتهم فيها وخرجوا على الدّين

وهكذا قد تجرؤا فى القرآن الكريم حتى حرّفوا فيه دون الإمعان والتعمّق.أعاذنا الله منه وهدانا إلى سواء الصراط.

****

الهوامش والإحالات

١) خالد بن عثمان السبت ، قواعد التفسير جمعًا ودراسة، الخبر دار بن عفان، المملكة العربية السعودية ، الطبعة الاولىٰ ، ١٤١٧ـ١٩٩٧، ص:١/٢١٠

٢) الزركشى، محمد بن عبدالله بدرالدين، البرهان فى علوم القرآن،بيروت، دارالكتب العلميّة ،الطبعة الاولىٰ، ١٤٠٧،ص:١/١٥

٣) المصد ر السابق، ص: ١/١٦

٤) الحربى ، حسين بن على حسين ، قواعد الترجيح عند المفسرين ،الرياض: دار القاسم ، الطبعة الاولٰى ١٤١٧ـ١٩٩٦،ص: ٢/٣٦٣

٥) الجوهرى، ص:٦/٢١

٦) نصر الهورينى،العلامة، مقدمة القاموس المحيط، بيروت: دار احياء التراث العربى، ص: ١/٢٥

٧) المصد ر السابق ، ص:١/١٧٠

٨) السيوطى، عبد الرحمٰن بن الكمال، جلال الدين، المزهر فى علوم اللغة وانواعها، مصر المكتبة الازهرية، ١٣١٠، ص: ١/٥

٩) سورة الفرقان : ٧٢

١٠) السيوطى، عبد الرحمٰن بن الكمال، جلال الدين، المزهر فى علوم اللغة وانواعها، مصر المكتبة الازهرية، ١٣١٠ ، ص: ١/٥

١١) الذهبى، محمدحسين، الدكتور، التفسير والمفسرون، القاهرة : مكتبة وهبة، بدون، ص: ١/٢٦٧

١٢) محمد زغلول سلام، الدكتور، اثر القران فى تطور النقد العربى إلى أخر القرن الرابع الهجرى، ص:٤٠

١٣) ابن قتيبه، عبدالله بن مسلم، أبى محمد، كتاب تاويل مختلف الحديث فى الرد على أعداء أهل الحديث، بيروت:دارالكتاب العربى، بدون، ص: ١٠١

١٤) الجاحظ، عمرو بن بحر، ابى عثمان، البيان والتبيين ، القاهرة: المؤسسة الخانجى، بدون، ص: ١/١٤

١٥) محمد زغلول سلام، الدكتور، اثر القران فى تطور النقد العربى إلى أخر القرن الرابع الهجرى، ص:٤٠

١٦) الجاحظ، عمرو بن بحر، ابى عثمان، كتاب الحيوان، مصرمكتبة الجاحظ، الطبعةالاولٰى،١٩٣٨ ص: ٢/٢٣٠

١٧) الذهبى، محمد حسين، الدكتور، التفسير والمفسرون، ص: ٢/ ٢٤٥

١٨) سورة الجن: ١٨

١٩) سورة الغاشية: ١٧

٢٠) الجاحظ، عمرو بن بحر، ابى عثمان، كتاب الحيوان، ص: ١/١٤٣

٢١) الحربى، حسين بن على بن حسين، قواعد الترجيح عند المفسرين، الرياض: دارالقاسم، الطبعة الاولىٰ،١٤١٧ هـ ، ص: ٣٦٦/٢

٢٢) سورة القيٰمة آية ١٧

٢٣) محمد زغلول سلام، الدكتور، اثر القرآن فى تطور النقد العربى إلى أٰخر القرن الرابع الهجرى،ص: ٢٥

٢٤) اهتم كثير من النحويين واللغويين فى القرون الثلاثة الاولى بوضع كثير من الكتب تحت أسماء "معانى القرآن " ومن هؤلاء الكسائى، والنضربن شميل وقطرب والأخفش وغيرهم، واينما ذكر أصحاب التفسير أصحاب المعانى فانّما يقصدون هؤلاء

٢٥) محمد زغلول سلام ، الدكتور، اثر القرآن فى تطور النقد العربى ،ص: ٥٠

٢٦) احمد امين، ضحى الاسلام، بيروت: دارالكتاب العربى، الطبعة العاشره ، ص: ٢ / ١٤١

٢٧) سورة الزمر: ٣٦

٢٨) سورة هود: ٥٢

٢٩) محمد زغلول سلام ، اثر القرآن فى تطور النقد العربى إلى آخر القرن الرابع الهجرى، ص: ٤٨

٣٠) الذهبى، محمد حسين، الدكتور، التفسير والمفسرون، ص: ١/ ٢٧٥

٣١) التفسير والمفسرون، ص: ١/ ٢٧٥

٣٢) الإصلاحى، امين احسن، مقدمة تدبر القرآن ، تحت عنوان، لغة القرآن، ص: ١٥

****

Educational philosophy Imam Al-Ghazali's perspective

Brig (R) Prof. Dr. Fazli Rabbi*

ABSTRACT

Islam is a divine religion. It is based on divine revelation (Holy Quran) and sunnah of the Holy Prophet ﷺ. As a religion it is a complete code of life. It does not deal with worships only but addresses all fields of life. Like Beliefs and worship, Islam focuses on education also. As a last and chosen religion, it motivates human beings to seek knowledge.

The first word of the first revelation (Chapter Al-alaq) starts with Iqra means Read. In first five ayat of chapter Al-alaq, the basic requirement for enhance of education (Read, knowledge and pen) have been mentioned six times. Similarly, the Holy Prophet ﷺ took many steps for imparting education. In this connection, the example of first residential university (Suffa'h) is sufficient.

Imam Ghazali one of the most famous Muslim thinkers discusses the education in his books in detail. He was born in 448 AH (1057 CE) at Tabaran a town in the district of Tus, which lies within the Khorasan Province of Iran and died on 18 December (1111 CE).

In this article knowledge, its classification, stages, curriculum, art of teaching, responsibility of both teachers as well as students have been discussed in the light of Imam Ghazali educational philosophy.

Keywords: educational philosophy, thinker, learning, classification of knowledge, stages of education

* Department of Islamic Studies, NUML, Islamabad

Introduction

Abu Hamid Muhammad bin Muhammad surnamed al-Ghazali was a great scholar, mystic, Sufi, thinker, jurist, philosopher and educationist. He has left an indelible mark on the cultural, religious and educational history of the world. As an educationist, we can rank him with his two great non-Muslim predecessors, Confucius and Plato. He gave much importance to education and wrote as many as one hundred books, out of which seventy eight works are still available.

His greatest work is Ahya-ul-Uloom-ud-din, which reflects his main philosophical and psychological thoughts. In the first chapter of this book, he has discussed the importance of knowledge, curriculum and finally the responsibilities of the teacher and the taught. His philosophy of education represents the high point of Islamic thinking on education. Here, he achieves a synthesis of legal, philosophical and mystical educational thinking. His philosophy is more than an expression of the spirit of the age in which he lived than a response to its challenges. His thinking on education and philosophy favoured continuity and stability over change and innovation.

For Al-Ghazali, the purpose of society is to apply Sharia and therefore the aim of education is to cultivate men so that they abide by the teachings of religion and is hence assured of salvation and happiness in the eternal life of the hereafter.

KNOWLEDGE AND ITS CLASSIFICATION

Purpose of Knowledge

The purpose of knowledge is to help man to achieve satisfaction, plenitude and to attain true happiness; [1] the happiness of the hereafter by drawing close to God and gazing upon His countenance. The value of learning lies in its usefulness and veracity. Hence, the religious sciences are superior to the secular sciences because they concern salvation in the eternal life of hereafter rather than this transient world as explained in the Holy book.

﴿وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ [2]

The life of this world is but a sport and a pastime, Lo!
The home of the Hereafter that is life. If they but know

Religious education contains greater truth than the secular sciences. This is not to say that secular sciences should be completely ignored. They have their uses too and are needed by society. Examples of such disciplines are medicine and linguistics.

CLASSIFICATION OF KNOWLEDGE:

Imam Ghazali has divided knowledge into two parts:

Beneficial knowledge (Sharai and Science):

As a scholar and teacher, Al-Ghazali was interested in the problem of knowledge, its concepts, methods, categories and aims. True knowledge in his view, is knowledge of God, His books, Prophets, kingdom of earth and heaven as well as knowledge of Sharia as taught by the Allah and Prophet ﷺ [2]. Such knowledge is

thus a religious science, even if it includes the study of certain worldly phenomena. This encapsulates those sciences that will benefit society and help it to progress, e.g. medical knowledge and mathematics. Accordingly, the acquisition of these sciences and disciplines is Fard al-Kifayyah, [3] (فرض الكفايه) i.e. if nobody acquires it, then the entire Muslim community of a particular locality will be sinful.

Neutral Knowledge:

This category encapsulates those disciplines that will not really enhance one's beneficial knowledge but there is nothing wrong if they are studied, e.g. the history of England, Europe and Asia etc.

Harmful Knowledge:

This category comprises of those disciplines which are harmful, such as black magic and gambling. It is therefore Haram to acquire such knowledge in accordance to the saying of the Holy Prophet ﷺ

((وَإِنَّ مِنْ الْعِلْمِ جَهْلًا وَإِنَّ مِنْ الشِّعْرِ حُكْمًا وَإِنَّ مِنْ الْقَوْلِ عِيَالًا)) [4]

"*Some knowledge is nescience, some poetry is full of wisdom and some quotes are burden"*

The Holy Prophet ﷺ seek refuge from these Knowledge

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا))[5]

"O Allah, I seek refuge in Thee from the knowledge which does not benefit, from the heart that does not

entertain the fear (of Allah), from the soul that does not feel contented and the supplication that is not responded."

In the light of the above, one must be obliged to be careful and be responsible in selecting his career. There are many fields that Muslims must take the lead. It is thus important to focus on these disciplines, and parents should ensure that their children study in the proper environment and with the right Islamic mindset in order to obtain the optimum result. Also it is incumbent for a person to learn the Islamic side of the field he is in.

STAGES OF EDUCATION

Childhood:

Man is born as "**tabula rasa**" and children acquire personality, characteristics and behavior through living in society and interaction with the environment. The family teaches the children its language, customs and religious traditions whose influence they can't escape. Therefore, the main responsibility for children's education falls on the parents and the teachers who subsequently share this responsibility. Al-Ghazali stresses the importance of childhood in character formation. It is therefore necessary to understand the special characteristics of this period in order to deal with the child in an effective and sound manner.

In the elementary stage, children learn the Quran and the sayings of the Holy Prophet's companions; they should be preserved from love, poetry and the company of men of letters, both of which sow the seeds of corruption in boy's souls. They must be advised

that their friends should possess the intelligence, good morals, good character, abstemiousness and truthfulness.

Youngster's Education

It is important that boys should begin to attend ,Maktab, (elementary school) at an early age, for what is learnt then engraved in stone. Those entrusted with the education of the boy at school should be aware of how this motivation develops and interests change from one period to another, followed by a love of finery and appearances (in infancy and childhood) then an interest in women and sex (adolescence), a yearning for leadership and domination (at the age of 20) and finally delight in knowledge of God (at the age of 40). These changing interests can be used by educators to attract the boys to school, by offering first the lure of ball games, then for ornaments and fine clothes, then responsibilities and finally by awakening a longing for the hereafter.

Level of Education

Ghazali then divides each branch of knowledge into three levels; elementary, intermediate and advanced and lists the books they may be studied at each level. He thinks that education is not merely a process whereby the teacher imparts knowledge, which the pupil may or may not absorb, after which the teacher and pupil each go their separate ways. Rather, it is an interaction affecting and benefiting teacher and pupil equally, the former gaining merit for giving instruction and the latter cultivation through the acquisition of knowledge.

Ghazali attaches great importance to the climate in which reading takes place, and to the kind of relations that are desirable in

doing so, he continuous and reaffirms the Islamic traditions of education, for him, the teacher should be a model and an example, not merely a source or medium of knowledge. His work is not limited to the teachings of a particular subject; rather, it should encompass all aspects of the personality and life of the pupil. The pupil in turn, has the duty to consider the teacher as a father to whom he owes obedience and respect.

CURRICULUM

Types of Curriculum

Al-Ghazali distinguishes clearly between two types of curriculum:

a. **Obligatory sciences** which must be studied by everyone, including religious sciences and related or ancillary disciplines such as linguistics and literature.

b. **Optional Sciences** which are studied according to the wishes and capacities of the student.

THE ART OF TEACHING

Among the principles governing the art of teaching al-Ghazali stresses that;-

a. Teaching should be linked to concrete situations and emphasizes the need for various types of knowledge and skills. Whenever a particular knowledge or skill is needed, it should be taught in such a way as to meet that need should be functional. He also stresses that learning is only effective when it is put into practice, and is aimed at inculcating the right habits rather than simply memorizing information. He comes close to the idea of "proficiency learning" when he recommends that the teacher should not move on from one

subject matter to another without first ensuring that the pupil has mastered the first subject matter and to the concept of the " complementarily of sciences". He advises that the teacher should pay attention to the interconnectedness of knowledge and the relations between its various branches.

Religious education

With respect to religious education, Al-Ghazali recommends an early introduction to the fundamentals of religion through inculcation; memorization and repetition, thus he feels no need for understanding at first. A subsequent stage involves explanation understanding and conscious practice. Here too, he continuous the Islamic traditions of education, in which the Quran was first to be memorized without being explained, the fundamentals of religion inculcated without clarification and practice was enjoined before the emergence of commitment rooted in conviction.

MORAL RESPONSIBILITIES OF TEACHERS

Ethico-psychological principles

Ghazali has propounded some of the most fundamental ethico-psychological principles for the teacher to be followed very honestly and faithfully by all while imparting education to the deserving ones. A teacher who generously and benevolently imparts education to others without being aware of getting any kind of remuneration in cash or kind from his taught is like the sun which is bright and showers its light on all without discrimination and will never be exhausted. A selfless teacher is like a rose full of fragrance and gives it to other people also. Any teacher who is niggardly in imparting that which he possesses to the deserving ones is an

intellectually miser and as such not teaching other he is committing a crime against humanity. The principles which must be followed by the teachers are:-

a. The teacher should cultivate an imaginative commiseration with his taught.
b. The teacher should teach and bring up his disciple just as his own son. Allah Almighty, on the Day of Judgment will adequately give the reward in accordance with the ayat

﴿يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾(6)

O my people! I ask of you no reward for it. Lo! My reward is the concern only of Him who made me have you then no sense

a. No stone should be left unturned and efforts spared in the reformation, education and correction 0f the student. Education is nothing if it does not revolutionize the out-look of the taught on life in a moral, intellectual and spiritual style.
b. By love and sympathy, the attention of student should be diverted towards the studies and not by force or any ilk of coercion.
c. While teaching certain branch of learning, the teacher should not belittle the importance of other faculties of knowledge. For instance, while teaching philosophy, the teacher should not minimize the significance of tafsir or fiqh etc, because it perverts the mind of the student and narrows down his vision.

d. The teacher should speak keeping in mind the intellectual level of the taught so that he may grasp what the teacher is saying.

e. A dull student should be tackled in such a way so that he may not feel awkward in the company of his intelligent fellows otherwise the former may suffer from inferiority complex which may undo every effect of education.

f. The teacher should be just and fair with all. He should not betray his weakness of liking a few and disliking the others.

g. The tutors must devote attention to religious education. They must be taught everything they need to know about the percepts of religious laws, and must learn not to steal, eat forbidden food, act disloyalty, lie, utter obscenities or do anything that children are prone to do.

h. If the boy obeys his tutors, has good morals, shows excellence and makes progress in his studies, he should be honored and praised in public so as to be encouraged and to incite others to imitate him. If he makes a mistake, but appears to be aware of it, tutor should not mind, for the boy may have understood his mistake and be determined not to repeat it. If however, he commits the same error again; his tutor should give him a small reprimand in private. The teacher may sometimes need to punish his pupils with a light beating, the purpose of which should be chastisement rather than physical injury.

i. The teachers should take into account the difference in character and ability among pupils, and deal with each one of them appropriately. The teachers should not push the pupils beyond their capacity, nor attempt to bring them to a level of knowledge, which they cannot absorb, since that is counterproductive. In a Hadith, the Holy Prophet (ﷺ) says:

> ((أمرت أن أخاطب الناس على قدر عقولهم))[7]
>
> *I have been ordered to talk to people according to their wisdom.*

To feed someone with the right food is to give life to burden someone with what is not right can only cause ruin.

j. In addressing the arts and artistic education, he deals with the general principles of education. He begins well by defining beauty and goodness as the perception of a thing in its entirety, but his Sufism quickly gets the better of him and he condemns listening to music and singing because they are associated with gatherings where wine is drunk. The only kind of singing to be allowed, in his view, is that of religious and heroic nature, or those sung at official festivities. Since such songs revive one's spirits, rejoice the heart and help one to carry on the work of this world and the next. However, an excess of music and singing should be avoided like medicine they should be take only in prescribed dose.

Moral responsibilities of the taught/student

Just like the teacher, Ghazali has prescribed some very hard and fast rules for the seekers of knowledge also. As the end of education is very sublime, therefore, the means to acquire it should also be very fair and noble, the efforts should be sincere and mothering should be spared to get knowledge. He advises students (especially those in higher education) to divide their days in the following manner, spending from dawn to sunrise in invoking God's blessing and private worship. From sunrise to mid-morning seeking knowledge from their professors, from mid-morning to mid-afternoon in writing notes and making fair copies, from mid-afternoon to sunset in attending learned gathering or in performing rites of invocation, begging forgiveness or glorification of God. The first third of the night should be spent in reading, the second third in prayer and the final third in sleep. In short he stressed on extreme efforts as mentioned in the Holy book

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (8)

Those who strive for us, we surely guide them to our paths and Allah is with the good

Finally, he proposes a "code of ethics" **(9)** where student should:-

a. Ensure that they are spiritually pure before they undertake the quest for knowledge.
b. Divert themselves of their worldly possessions, detach themselves from hearth and home and devote to the search for knowledge and the pursuit of the hereafter.

c. Respect the rights of their teachers and behave in a civilized manner.
d. Beware, especially at the beginning of their studies, of paying too much attention to doctrinal controversies.
e. Master the fundamentals of the praiseworthy sciences (linguistics, tafsir, hadith, fiqh and kalam) and then specialize by studying one or more of those sciences in greater depth.
f. Choose useful subjects in which to specialize, especially those that are not conducive to salvation in the hereafter.
g. Study each subject thoroughly before going on to another bearing in mind the logical sequence and interconnected-ness of various disciplines.
h. Have as their main goal in their search for knowledge the cultivation and perfection of the innermost set in this world and proximity to God in the hereafter rather than the attainment of high office or the acquisition of wealth or fame.

The impact of Al-Ghazali Philosophy

Al-Ghazali died at the age of 55, after a life that was not as long as it was productive, wide-ranging and influential. He is rightly considered to be one of the most important and profound Islamic thinkers, who were aptly called, the "renovator of the fifth century A.H. his influence may be witnessed by a number of factors such as:-

a. The profundity, power and comprehensiveness of his thought contained in some fifty different works, which are still studied today.
b. The fact that his view were well suited to his age and milieu and were more a reflection of that age than a response to its needs and requirements they constituted more an element of continuity and conservation that a factor renewal and change.
c. After Al-Ghazali, Islamic society and thought entered into a long period of stagnation and decline producing few great minds. Al-Ghazali thus remained alive and influential.

CONCLUSION

Al-Ghazali's writings on education constitute the high point of thinking on the subject in the Islamic world. The theory of education he elaborated is the most complete edifice relating to the field. It clearly defies the aims, lays out the path and means whereby the objectives can be achieved. From 12-19th century (A.D), Islamic educational philosophy was heavily influenced by him. Indeed, theoretical and practical educationists, with few exceptions, hardly did anything other than borrow from Al-Ghazali and summarize his ideas and books.

Education is not limited to training the mind and filling it with information but involves all aspects i.e. intellectual, religious, moral and physical of the personality of the learner; it's not enough to impart theoretical learning, that learning must be put into practice. True learning is that which affects behavior and where by the learner makes practical use of his knowledge.

REFERENCES

1. Sura Al Ankabut, Ayah No. 64
2. Imam Ghazali,Ahya-ul –uloom,Dar-ul-Ishaat,urdu bazaar Karachi,1398.AH,chapter 1,section 2
3. ibid
4. Sunan Abu Dawood, kitab ul adab, Hadith No: ٥٠١٢
5. Sheh Muslim, Hadith No: 2722
6. Surah Hud, Ayah No. 51
7. Al sakhavi,Al-maqased al –hasana,p: ١64
8. Surah Al-ankaboot, Ayah No. 64
9. Ahya-ul –uloom, chapter 1,section 5

BIBLIOGRAPHY

1. Al-Quran
2. Aslam, Muhammad (1999). Imam Ghazali's Philosophy of Education. Thesis, College of Army Education, Murree
3. Faris, Nabih Amin (1962). The book of knowledge (Al Ghazali). Sh Muhammad Ashraf (Translation of Ahya ul Uloom), Lahore
4. Ghazali, Abu Hamid Muhammad (1972). Encyclopedia of Philosophy. Edited by Paul Edward. MacMillan, Vol 3: 327, New York
5. Khan, Shafique Ali (1976). Ghazali's philosophy of Education. Markaz I Shaoor o Adab, Hyderabad
6. Shahid, S. M (2000). Foundations of Education. Majeed book Depot, Lahore

****

Privacy in Islam, a sacred human right

Dr. Atique Tahir [*]

ABSTRACT

'Right to Privacy' or the' Privacy of an individual' is considered as the most important and the most basic of all the fundamental rights and liberties. It is the concern of all legal systems, civilizations, cultures and religions.

In the modern Western and legal perspectives, the right to privacy has emerged from the concept of right to life, which is considered as the basic right from which all the other rights are derived. Islam, on the other hand, considers as an independent and separate human right.

The present study is an attempt to briefly reflect and accumulate all the aspects and dimensions of the Privacy right in Islam. It is mainly concerned with the privacy of one's home, confidential correspondence investigating someone's financial, private and family affairs, and other such violations, Its punishment prescribed by Islam and its implications on an human society, arising out of doubts, suspicions, accusations and mistrust, in the teachings of Quran and Sunnah of the Messenger ﷺ in particular and of the Islamic jurists in general.

Keywords: Islam, Privacy, Rights, sacred, Human.

[*] Assistant Professor, Faculty of Shariah and Law, International Islamic University, Islamabad

In Islam 'right to Privacy' is considered as a basic and one of the sacred human rights. It covers all aspects of privacy, like peeping into other's house, reading someone's letter without permission, investigating someone's financial, private and family affairs, etc. [(1)]

The Holy Quran honoring the sanctity of Privacy in homes states as:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ [(2)]

> "*O, you who believe! do not enter houses other than your own until you have asked permission and saluted the dwellers therein; that is best for you, Allah admonishes you, so that you may heed*".

The Messenger ﷺ has gone to the extent of instructing his followers that "a man should not enter even his own house suddenly or surreptitiously. He should somehow or other inform or indicate to the dwellers of the house that he is entering the house, so that he may not see his mother, sister or daughter in a condition in which they would not like to be seen, nor would he himself like to see them in that condition". [(3)]

In the same vein it is narrated by Abdullah Ibn Masoood (RA) that Allah's Messenger ﷺ : said:

"عليكم أن تستا ذنوا علي أمها تكم وأخواتكم" [(4)]

> *It is incumbent on you to take the permission (to enter into your own houses) from your mothers and sisters.*

The Messenger ﷺ also said:

((الاسْتِئْذَانُ ثَلاَثٌ، فَإِنْ أُذِنَ لَكَ، وَإِلَّا فَارْجِعْ)) [(5)]

> *Take permission three times and if it is not granted, then you should go back.*

Peeping into the houses of other people has also been strictly prohibited, so much so that there is the saying of the Messenger that:

> "If a man finds another person secretly peeping into his house, and he blinds his eye or eyes as a punishment then he cannot be called to question nor will he be liable to prosecution".

In another Hadith the "Messenger prohibited people from reading letters of the others and warned that even if a man casts sidelong glances in order to see a letter of another person, his conduct becomes reprehensible". **(6)**

Instructions to enter the houses of relatives and friends are given in the Quran as:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاء ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوَّافُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ **(7)**

> "*O, you who believe: Let your servants and those of your children who have not yet come of age ask your permission before coming into your rooms on three occasions: before the morning prayer; at noon when you take off your clothes in the noonday heat; and after the night prayer. These are your three times of privacy. There is no sin for you or for them if they come without permission at other times than these, for; you have to visit one another for various purposes. Thus does Allah make His Commands clear to you, for He is All-Knowing, All Wise".*

Allah says

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاء اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحاً فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَن يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَن يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ﴾ (8)

"There is no sin for such elderly women as are past the age of marriage, if they lay aside their outer garments, provided they do not wantonly display their beauty. Nevertheless, it is best for them if they behave modestly".

There are many other ahadith of the Messenger of Allah ﷺ, wherein emphasis is on caring the privacy of others. Some of the ahadith in this regard are worth mentioning.

((يَا مَعْشَرَ مَنْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الإِيمَانُ إِلَى قَلْبِهِ، لاَ تُؤْذُوا الْمُسْلِمِينَ وَلاَ تُعَيِّرُوهُمْ وَلاَ تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ تَتَبَّعَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِي جَوْفِ رَحْلِهِ))(9)

"Oh people! who have accepted Islam with your tongues but whose hearts have not been reached by faith, do not misbehave with Muslims, nor revile them, nor seek out their faults; for he who seeks out the fault of his Muslim brother will have, his fault sought out by Allah, and he whose faults are sought out by Allah will be exposed by Him even though he is in the privacy of his house".

Hazrat Abdullah bin Busr (RA) said that: "when Allah's Messenger ﷺ

((إِذَا جَاءَ الْبَابَ يَسْتَأْذِنُ لَمْ يَسْتَقْبِلْهُ "، يَقُولُ: " يَمْشِي مَعَ الْحَائِطِ حَتَّى يَسْتَأْذِنَ، فَيُؤْذَنَ لَهُ، أَوْ يَنْصَرِفَ)) (10)

Came to any one's door he did not face it squarely, (but faced the right or left corner) and stand with the wall, (that

was because there were no curtains on the doors of the houses at that time) asking permission and if he got it enter (the home) otherwise left".

Hazrat Abu Umamah (RA) narrated that Allah's Messenger ﷺ said:

((ثَلَاثَةٌ كُلُّهُمْ ضَامِنٌ عَلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ: رَجُلٌ خَرَجَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللَّهِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُ فَيُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، أَوْ يَرُدَّهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ وَغَنِيمَةٍ، وَرَجُلٌ رَاحَ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللَّهِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُ فَيُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، أَوْ يَرُدَّهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ وَغَنِيمَةٍ، وَرَجُلٌ دَخَلَ بَيْتَهُ بِسَلَامٍ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ)).[11]

"*There are three persons for whom Allah is guarantee. Allah suffices for them during their life and after their death. Their place is in Paradise. One who entered his house after having saluted, then Allah is his guarantee. One who went towards the mosque (for saying prayer), then Allah is his guarantee. One who left for Jihad in the way of Allah, then Allah is his guarantee".*

Ata bin Yasar (RA) told that a man asked Allah's Messenger ﷺ whether he should ask permission to go in where his mother was and he replied that he should. The man said that he lived along with her in the house, but Allah's Messenger ﷺ replied:

((يَسْتَأْذِنُ الرَّجُلُ عَلَى وَلَدِهِ، وَأُمِّهِ – وَإِنْ كَانَتْ عَجُوزًا – وَأَخِيهِ، وَأُخْتِهِ، وَأَبِيهِ))[12]

A man should ask permission from his son and his mother, even if she is old, his brother, his sister and his father.

Islam aims at establishing its society on clearness of conscience and mutual trust, not on doubts, suspicions, accusations

and mistrust keeping in view the evil consequences of such activities the Messenger of Allah ﷺ has forbidden seeking out the faults of others:

((مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، سَتَرَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ كَشَفَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، كَشَفَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ، حَتَّى يَفْضَحَهُ بِهَا فِي بَيْتِهِ)) .[13]

"He who seeks out the fault of his Muslim brother will have, his fault sought out by Allah, and he whose faults are sought out by Allah will be exposed by Him even though he is in the privacy of his house".

In another tradition of the Messenger ﷺ, concealing the secrets of others is highly commended, and the act has been compared in merit to bringing to the surface a girl buried alive.

((مَنْ رَأَى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا، كَانَ كَمَنْ أَحْيَا مَوْءُودَةً)) .[14]

"*Who came to know the secret of a person and conceals it is like who gives life to a buried girl".*

In Islam the basic assumption concerning people is that they are innocent, a mere suspicion should not be allowed to result in the accusation of an innocent person. Regarding this, the Messenger ﷺ said:

((إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ)) .[15]

Avoid suspicion, for airing suspicion is the most lying form of speech

Islam for the protection and sanctity of homes has gone to that extent that if some is peeping through someone's with the permission of the owner then if the owner hits on his eyes with a stone and as a result his eye is damaged, this will not be treated as cognizable offence.

One of the hadith of the Messenger ﷺ, narrated by Abu Hurairah (RA) speaks on the subject as:

((مَنْ اطَّلَعَ فِي دَارِ قَوْمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِمْ، فَفَقَئُوا عَيْنَهُ فَقَدْ هَدَرَتْ عَيْنُهُ)) [16]

Whosoever peeps through anyone's house without permission and his eye is damaged; the act will not be treated as cognizable.

According to Islam it is not permissible for a government to injure the integrity of private houses by searching them on the grounds that it is necessary to know the secrets of the dangerous persons. Though, to all intents and purposes, the basis of this policy is the fear and suspicion with which modern governments look at their citizens. This is exactly what Islam has called as the root cause of mischief in politics.

The Messenger ﷺ in this regard instructs the believers as:

((إِنَّ الْأَمِيرَ إِذَا ابْتَغَى الرِّيبَةَ فِي النَّاسِ أَفْسَدَهُمْ)). [17]

"When the ruler begins to search for the causes of dissatisfaction amongst his people, he spoils them".

Hazrat Muawiyah (RA), a companion of the Messenger ﷺ of Islam has said that he himself heard the Messenger ﷺ saying:

((إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَهُمْ أَوْ كِدْتَ أَنْ تُفْسِدَهُمْ)). [18]

If you try to find out the secrets of the people, then you will definitely spoil them or at least you will bring them to the verge of ruin.

Perhaps the most instructive incident is one relating to the Caliph Umar (RA), which shows how strongly Islam safeguards the human right to privacy. It is related that one night, "Umar (RA) was touring the city of Madina to find out the conditions of the Muslims. Suddenly, he came across a house from where he heard a man

singing inside his house. He, suspecting some mischief, started peering into the house where he saw a woman and some wine along with the man" .On being reminded of the fact that he was violating their right of privacy he gave up his idea of punishing the man and let the man free after taking oath from him that he would live a pious life in future. **(19)**

Keeping in view the above mentioned picture of right to privacy in Islam a famous Pakistani Journalist, Salahuddin, speaks as:

> "Under Islamic law neither bugging devices can be fixed in private houses to tape conversations taking place behind the closed doors, nor can letters be censored in transit as is done in modern civilized states". **(20)**

In Islam, it is the obligation of the state that it should make efficient arrangements for the protection of the honor and repute of the people, which is not limited; it extends to their honor, repute and privacy of homes. In this regard, Islam declares any interference or encroachment on the privacy of his life, as illegal and sinful. **(21)**

IMPLICATIONS

The term 'Privacy' reflects diversity of meanings, in different context, but mainly it stands for a 'right to seclude from others'.

Islam takes the 'right to Privacy' as a basic and sacred human right, inculcating and recognizing all the possible dimensions and aspects of it. Both the Quran and Sunnah of the Messenger ﷺ are replete with such references, emphasizing on its various dimensions to be implemented in true letter and spirit.

The believers in Islam are obliged to respect the privacy of others, considering it as an integral part of their faith and a religious duty.

Islam guarantees rewards and give glad tidings of Paradise for them who observe Privacy law, prescribed by Shariah.

Islam aims at establishing its society on clearness of conscience and mutual trust, without doubts, suspicions, accusations and mistrust. In Islam the basic assumption concerning people is that they are innocent, a mere suspicion should not be allowed to result in the accusation of an innocent person.

According to Islam it is not permissible for a government to injure the integrity of private houses by searching them on the grounds that it is necessary to know the secrets of the dangerous persons. Though, to all intents and purposes, the basis of this policy is the fear and suspicion with which modern governments look at their citizens. It is the obligation of the state that it should make efficient arrangements for the protection of the honor and repute of the people, which is not limited; it extends to their honor, repute and privacy of homes. In this regard, Islam declares any interference or encroachment on the privacy of his life, as illegal and sinful.

REFERENCES

1. Muhammad Ismail Memon Madani, The Islamic Commandments of Hijab, Kazi Publications, Lahore, 1998, p.32
2. Surah Al noor:27
3. Abu al-Ala Mawdoodi, Al-Tawhid, Vol.4, No.3, The Islamic Foundation, London, Rajab-Ramadan, 1407, April-June, 1987, p. 72, 73
4. See Ibn Jarir,Baihaqi and tafseer Adwa-ul –Bayan, p.352
5. Al-Bukhari , Hadith No.2153
6. Abu al-Ala Mawdoodi, Human Rights in Islam, Islamic Foundation, Leicester, UK, 2nd Edition, 1980, p.28, 267
7. Surah Al noor: 58
8. Surah Al noor: 60
9. Sunan,Al-Tirmizi,Hadith No.2005
10. Musnad Ahmad,Hadith No.17662
11. Sunan Abi- Dawd, Hadith No.2146
12. Al-Bukhari,Al Adabul Mufrid Hadith No.1062
13. Sunan Ibn Majah,Hadith No.2542
14. Sunan Abi- Dawd, Hadith No.4268
15. Al-Bukhari,Hadith No.5724
16. Sunan Abi- Dawd, Hadith No.5172
17. Sunan Abi- Dawd, Hadith No.4889
18. Sunan Abi- Dawd, Hadith No.4888
19. Abu al-Ala Mawdoodi, Tafhim-ul-Quran, Vol.5, Idara Tarjuman –ul Quran, Lahore, 1974, 30th Edition, p. 89
20. Salahuddin, Bunyadi Huquq, Idara Tarjuman –ul Quran, Lahore, 1st Edition, 1978, p.252

21. Abu al-Ala Mawdoodi, Al-Tawhid, Vol.4, No.3, The Islamic Foundation, London, Rajab-Ramadan, 1407, April-June, 1987, p. 72, 73; Ziaduddin Ahmad, Al-Quran Divine Book of Eternal Value, Royal Book Company Karachi, 1st Edition, 1989, p.171

****